# دیوانگی کے بیج فرزانگی

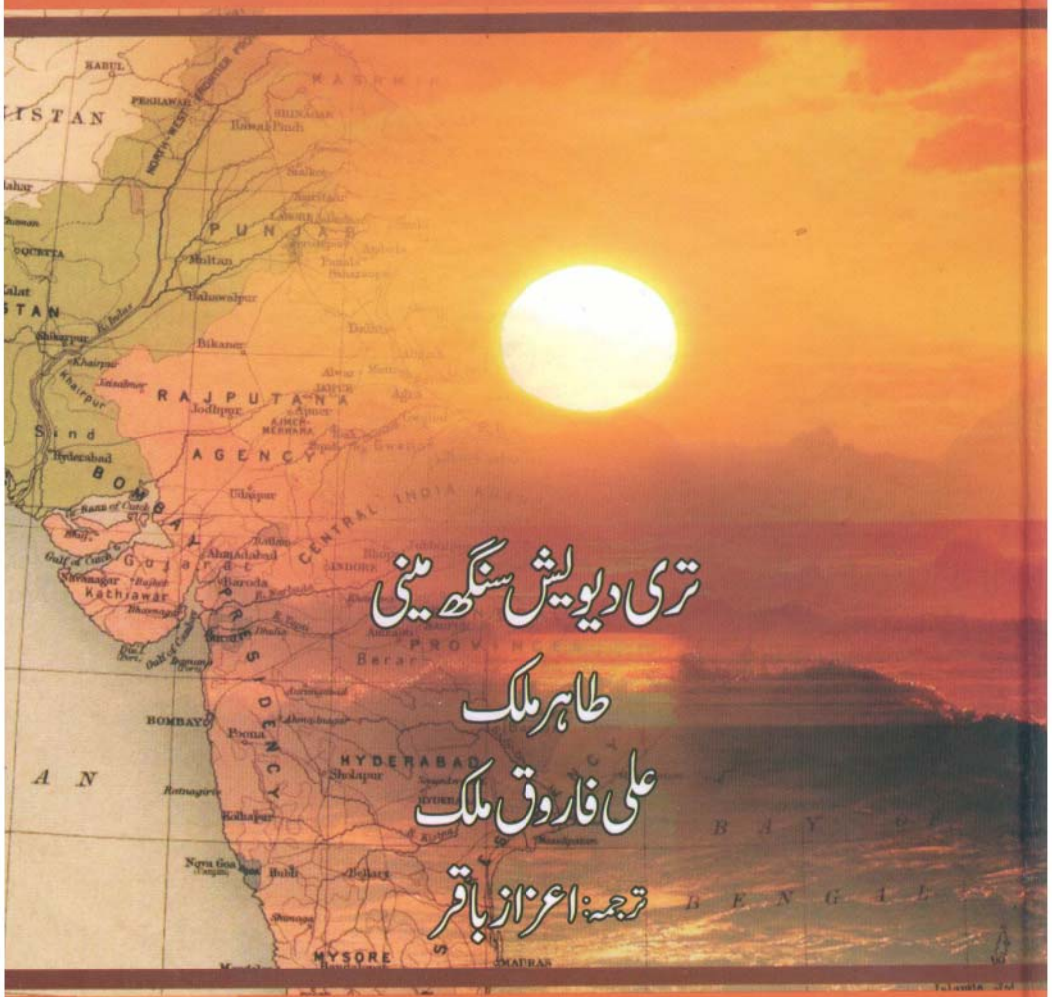


تری دیویش سنگھ مینی

طاہر ملک

علی فاروق ملک

ترجمہ: اعزاز باقر

مشعل

# دیوانگی کے بیج فرزانگی

تری دیویش سنگھ مینی

طاہر ملک

علی فاروق ملک

ترجمہ: اعزاز باقر

مشعل بکس

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ 54600، پاکستان

# دیوانگی کے بیج فرزانگی

تری دیویش سنگھ مینی
طاہر ملک
علی فاروق ملک
ترجمہ: اعزاز باقر

کاپی رائٹ اردو © 2013 مشعل بکس

کاپی رائٹ © 2009 تری دیویش سنگھ مینی، طاہر جاوید ملک، اور علی فاروق ملک

ناشر: مشعل بکس
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

پرنٹرز: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور
قیمت: -/360 روپے

1947ء کے جنوبی ایشیائی خونی فسادات کی لپیٹ میں آنے والوں اور

''انسانیت کے اُن سپاہیوں'' کے نام جنہوں نے دوسرے انسانوں کی

زندگی بچانے کے لئے بار بار اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا۔

# اظہارِ تشکر

اگرچہ اس کتاب کی تکمیل میں ہمیں بہت سے لوگوں کا تعاون حاصل رہا، مگر درج ذیل افراد خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً ہماری رہنمائی کرنے کے ساتھ ہی ہمیں اہم معلومات اور نکات بھی فراہم کئے۔ جناب احمد سلیم، جناب اسیش نندی، پروفیسر اکبر ایس احمد، جناب اویس شیخ، مسز اندرا کتھپا کیا، جناب بلوندر جیت سنگھ وڑائچ، جناب ندیم مرزا، ڈاکٹر ستوکھ سنگھ، پروفیسر طاہر کامران، ڈاکٹر گرپریت مائینی اور جناب گرپریتش ایس مائینی

# مندرجات

پیشِ لفظ ..... 6

تعارف ..... 9

انڈیا کے تجربات ..... 57

پاکستان کے تجربات ..... 107

چند تفکرات ..... 145

مستقبل کی طرف نگاہ ..... 159

# پیش لفظ

یہ کتاب عالمی سطح پر مطالع کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے: جنوبی ایشیاء کے باشندوں کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ تاریخی حقائق سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ کتاب کے مدیر، انڈیا سے تعلق رکھنے والے تریدویش سنگھ اور پاکستانی صحافیوں طاہر ملک اور علی فاروق ملک نے 1947ء کے ان تاریخی واقعات پر توجہ مرکوز کی ہے جن کے نتیجے میں برصغیر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ہندوستان کی تقسیم نے ہمیں انسانیت کے بعض بدترین پہلوؤں سے آشنا کیا۔ تاہم ان تاریک دنوں میں بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ ماند نہیں پڑ سکا۔ بہت سے لوگوں نے ثقافتی اور مذہبی تفریقوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور بھائی چارے کا مظاہرہ کیا۔ اس کتاب میں جو واقعات شامل کئے گئے ہیں ان میں ہمیں نفرت اور تشدد کی خصلت پر انسان دوستی کا جذبہ غالب دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدترین مایوسی اور وحشت کے لمحات میں بھی انسانوں کو ابھی تک رہنمائی، محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ یہ ایک قیمتی سبق ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب کو لکھنے کا ایک اور مساوی طور پر اہم سبب یا مقصد یہ بھی ہے کہ جنوبی ایشیا کے عظیم عقائد کو ہمدردی اور نیک نیتی کے واقعات کی بنیاد پر دوبارہ ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جنوبی ایشیاء دنیا کے تمام عظیم عقائد کا گڑھ ہے اور یہ کہ ہندومت، بُدھ مت اور سکھ مذہب کی طرح بعض اہم عقائد نے اسی سرزمین پر جنم لیا۔ لہٰذا جنوبی ایشیاء کی ثقافتی اور مذہبی مرکز کے طور پر عالمی اہمیت کو اس حقیقت کی بناء پر تسلیم کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

جنوبی ایشیاء میں ایک ارب 40 کروڑ باشندے آباد ہیں۔ یہ چار ممالک یعنی افغانستان، انڈیا، پاکستان، اور بنگلہ دیش پر مشتمل خطہ ہے۔ اس علاقے کی تاریخ عظیم موریہ اور مغل سلطنتوں کی تاریخ ہے: اس خطے میں تاج محل کی طرح تعمیر کے عظیم الشان نمونے موجود ہیں۔ اشوک، اکبر، اور اس کے علاوہ محمد علی جناح، ایم۔ کے۔ گاندھی، اور جواہر لعل نہرو جیسے عظیم حکمرانوں ورہنماؤں نے بھی یہیں جنم لیا۔ علامہ اقبال اور مولانا آزاد جیسے عظیم علماء اور شاعروں نے بھی اپنے تخیل اور تصورات سے کئی نسلوں کے اندر ایک نئی روح بیدار کی۔ نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور نے جنوبی ایشیا کو دنیا میں نمایاں مقام دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس کے باوجود 1947ء میں ہندوستان کی دو ریاستوں، یعنی بھارت اور پاکستان کی شکل میں تقسیم نے تکالیف اور انتشار کی نئی داستانوں کو جنم دیا۔ تقریباً 20 لاکھ کے قریب لوگوں کو ذبح کر دیا گیا اور کوئی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ افراد کے گھر اجاڑ کر اُنہیں نقل مکانی پر مجبور کر دیا گیا۔ جنوبی ایشیاء کی اہم اور قابل تکریم شخصیات گاندھی، نہرو اور جناح اس صورتحال سے صدمے اور دہشت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ ان سب نے سکون اور حواس کا مظاہرہ کرنے کی التجائیں کیں مگر سب التجائیں رائیگاں چلی گئیں۔ ان میں سے کسی رہنما نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ انڈیا اور پاکستان کی تاریخ ایسی شکل اختیار کر لے گی جیسی شکل کہ وہ اختیار کر چکی ہے: تین جنگیں، بے معنی قسم کے تصادم اور اس کے علاوہ فوج پر اربوں ڈالر کا خرچ جبکہ کروڑوں لوگ غربت کی چکی میں پس رہے ہوں۔

جنوبی ایشیا جو کہ اپنی مخصوص تاریخ کی بناء پر عالمی سطح کی قیادت کو مختلف عقائد کی سمجھ کے حوالے سے آپس میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا شعور دے سکتا تھا ابھی تک 1947ء کے صدمے سے مکمل طور پر جانبر نہیں ہو سکا۔ اس لئے سب سے پہلا قدم یہی ہونا چاہیے کہ ان دنوں رونما ہونے والے المناک انسانی واقعات کا سامنا کیا جائے اور بھر زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ روئے زمین کے مستقبل کا دارومدار باہمی گفتگو وشنید اور ایک دوسرے کے نکتۂ نظر کو سمجھنے کی کوششیں جاری رکھنے پر ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کو مرتب کرنے کے کام میں تریدیویش سنگھ نے پہل قدمی کا مظاہرہ کیا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، تو میں نے 1947ء میں ایک پناہ گزین کے طور پر

انڈیا سے فرار ہونے اور تشدد کی لہر سے بال بال بچ جانے والے انسان کی حیثیت سے اس کا ذاتی طور پر یہ تجربہ کیا ہے کہ نفرت اور غصہ کتنے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کی شکل میں کی جانے والی کوششیں جن کا مقصد ایسے عوامل کو سامنے لانا اور مثبت رنگ میں پیش کرنا ہے جو ہمارے درمیان اتفاق و یگانگت پیدا کریں بہت موزوں اور برمحل ہیں۔

چنانچہ یہ وہی جذبہ ہے جس کے تحت میں نے ''داراشکوہ کا مقدمہ'' (The Trial of Darashikoh) نامی ڈرامہ لکھا تھا جو امریکن یونیورسٹی میں سٹیج کیا گیا تھا۔ یہ ڈرامہ سترھویں صدی کے جنوبی ایشیاء کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ داراشکوہ جو کہ ایک مجذوب تھا، اور اس کے قدامت پسند بھائی اورنگزیب کے درمیان اقتدار کی کشمکش اور مغلیہ سلطنت کے مستقبل کے دور حکمرانی کی کہانی ہے۔ ڈرامہ بذات خود جنوبی ایشیاء اور دنیا کے دیگر حصوں میں مذاکرات و گفت شنید کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ڈرامے میں ہندو، مسلمانوں اور سکھوں نے بہت گرمجوشی سے اپنے کردار ادا کئے اور ان کا جذبہ سامعین کے دلوں کو متاثر کر رہا تھا۔

اگر ہمیں آج کی دنیا میں مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے مابین بڑھتے ہوئے تفاوت پر قابو پانا ہے تو ہمیں ایسی مزید کوششیں کرنی پڑیں گی۔ چنانچہ یہ کتاب مذاکرات یا مکالمے کے روایت کو فروغ دینے اور تاریخ کے ایک فیصلہ کن دور کے بہت عرصے سے درکار تجزیئے کے حوالے سے بہت قابل قدر اثاثہ ثابت ہوگی اور میں ترید یویش سنگھ اور ان کے ساتھی مدیران یا مرتبین طاہر ملک اور علی فاروق ملک کی اس حوالے سے کی جانے والی کاوش کو ستائش کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

پروفیسر اکبر احمد
ابن خلدون چیئر آف اسلامک سٹڈیز
امریکن یونیورسٹی
واشنگٹن ڈی۔سی

# تعارف

برصغیر کی پاکستان اور انڈیا دو حصوں میں چیر پھاڑ کر نتیجہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی تقسیم کے ساتھ ہی ایک کروڑ ستر لاکھ انسانوں کی ہجرت یا نقل مکانی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ایک طرف تو وہ ہندو اور سکھ تھے جو موجودہ پاکستان سے ہجرت کر کے انڈیا چلے گئے اور دوسری طرف انڈیا میں رہنے والے مسلمان ہجرت کر کے مغربی پاکستان (اب پاکستان) اور مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) چلے گئے۔ اگر صرف پنجاب کی حد تک ہی دیکھا جائے تو ہجرت کرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ سے لے کر ایک کروڑ تیس لاکھ تک بنتی ہے۔ ہجرت کا یہ سارا عمل دو ماہ کے اندر ہی پایہ تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ واقع ہونے والی کل اموات کی درست تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ 1) علاوہ ازیں اس عرصے کے دوران گمشدگی اور خواتین کے اغواء کے بہت سے واقعات بھی رونما ہوئے جن کو حقیقت میں ابھی تک کسی شمار میں ہی نہیں لایا گیا۔ بہت سی ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں جن میں کئی خاندان بھی جدا ہو کر رہ گئے۔ 2) اگرچہ کبھی کبھی یہ خیال بھی ذہن پر مُسلط ہو جاتا ہے کہ 1947ء کی تقسیم ایک طرح سے یہودیوں کے ''عظیم قتل عام'' کی مانند ہے، مگر ان دونوں صورتوں میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے: 1947ء کی تقسیم ایک اجتماعی قتلِ عام تھا جس کی ذمہ داری کسی ایک سماجی طبقے پر نہیں ڈالی جا سکتی، نہ ہی کسی طبقے کو مکمل طور پر بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک بڑے پیمانے کی ہجرت، معصوم افراد کے قتل، خواتین کے اغواء اور عصمت دری سے بھی بڑھ کر جو چیز تقسیم کے حوالے سے ابھی تک سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت کی حامل دکھائی

دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے، اور جسے بعض لوگ ''تاریخی رزمیہ داستان'' بھی کہتے ہیں، جو کہ ہم اپنے ذہنوں سے کبھی محو نہیں کر سکتے اور جو مختلف لوگوں کے لئے مختلف حقائق کی عکاسی کرتا ہے: پاکستانیوں کے لئے ایک نیا وطن، اگر چہ اس کے لئے انہیں بے دخلی اور وطن سے ہجرت کے عمل سے گزرنا پڑا: خطہ پنجاب میں رہنے والے شمالی ہندوستانیوں کی وسیع تعداد کے لئے بھی اپنے وطن سے بیدخلی۔ اور آخری نکتہ یہ کہ انڈیا اور پاکستان کی موجودہ نسلوں کے لئے برصغیر کی تقسیم تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ ہے، اور اگر برصغیر کے سب سے اہم نہیں تو اہم ترین ادوار میں سے ایک ہے۔3) بعض لوگوں کو یہ بہت مایوس صورتحال لگتی ہے کیونکہ وہ اس دور سے غیر منقسم برصغیر کی داستانیں سنتے چلے آ رہے ہیں جب سے ان کے باپ دادا موجودہ دور کے انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے یا پھر اس کے برعکس صورتحال۔ دوسروں کے لئے یہ محض اس واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جس کا اخبارات، رسائل وجرائد، کتابوں اور ناولوں میں بار بار ذکر کیا گیا ہے یا پھر ڈراموں، فلموں اور دستاویزی فلموں میں اس کی منظر کشی کی جاتی رہتی ہے۔

برصغیر کی تقسیم کو دو زاویوں سے نمایاں کیا جا سکتا ہے، یا تو نفرت میں اضافے کیلئے یا پھر اس دور کے تشدد اور دیوانگی سے سبق سیکھنے کے لئے۔ چھ سے زیادہ عشروں کے دوران، اس وقت سے جب سے کہ انڈیا اور پاکستان آزاد ہوئے ہیں یعنی برصغیر کی تقسیم کے وقت سے لے کر اب تک قیمتی زندگیوں کے نقصانات، عصمت دری اور آتش زنی کے واقعات کے ساتھ ہی ان سب کے پس پردہ عقیدے اور قوم پرستی کے کردار پر خاطر خواہ تحقیق کی جا چکی ہے۔ اس تمام تر تحقیق سے ابھی تک کوئی ایسا نتیجہ / سبق اخذ نہیں کیا جا سکا جو کہ ہماری مثبت رہنمائی کر سکتا ہو۔ اس کی بجائے اس کے نتیجے میں پر دو ممالک کے درمیان نفرت اور زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تقسیم ایک ایسا بادل ہے جس میں اُمید دلانے والی چاندی کی کرنیں بہت کم ہیں۔ جب ہم ''چاندی کی اُمید دلانے والی کرنیں'' کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہونا ہے کہ وہ واقعات جن میں مذہب اور قوم پرستی پر انسانیت کا جذبہ غالب آ گیا تھا۔ ان میں معاشرے کے مختلف سماجی طبقات کی طرف سے بچاؤ یا نجات دہندگی کی ایسی مثالیں شامل ہیں جیسے لوگوں کو خطرے کی حالت میں لوگوں کو پناہ دینا یا خطرہ سر پر آنے سے قبل ہی ان کو انتباہ کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ اور جو لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول تھے ان کے لئے اس کا مطلب تھا کہ ہجوم کو قابو میں رکھنا جو کہ امن

عامہ کوخراب کرنے پر تُلا ہوا تھا اور بچاؤ کی زیادہ اہم صورتوں میں سے دوصورتیں خواتین کی آبرو کا تحفظ اور اغواء شدہ خواتین کی بازیابی میں مدد کرنے کی مثالوں کی ہیں۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تقسیم کے ''مثبت پہلوؤں'' کے حوالے سے کوئی تحقیق نہیں کی گئی کیونکہ درحقیقت اسی طرح کے بے شمار واقعات مشاہدے میں آئے تھے۔ ایک ممتاز دانش ور اشیش نندی، جس نے کہ تقسیم کے حوالے سے تحقیق کے دوران تشدد اور دوسرے بھیانک واقعات کی زد سے محفوظ رہنے والے افراد کا انٹرویو کیا، اسی یقین کا اظہار کرتا ہے کہ تقریباً 25 فیصد مسلمانوں نے غیر مسلم لوگوں کو بچایا تھا اور اسی طرح اس کے برعکس دیکھنے میں آیا۔ 4) ان واقعات میں وہ مثالیں بھی شامل ہیں جن میں بہت سے افراد نے کئی طریقوں سے اپنے نام نہاد ''دشمن'' کو بچانے کے لئے خود اپنی زندگیاں بھی خطرے میں ڈال دیں، مثلاً پناہ دے کر، بھیس بدل کر یا پھر فرار کروانے میں صحیح طریقے سے رہنمائی کر کے۔

یہ کوئی تھوڑی تعداد نہیں ہے تاہم بعض وجوہات کی بناء پر تقسیم کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ 5) نندی ان کی بالکل درست طور پر نشاندہی کرتا ہے۔ 6)

> ''بہت سے افراد کو جو فسادات کی لپیٹ میں آنے سے بچ گئے تھے، ابھی بھی یاد ہے کہ ان تلخ ایام میں جبکہ مختلف طبقات کے مابین تعلقات اپنے نکتۂ عروج پر تھے، بہت سے افراد اور طبقات تشدد کی کاروائیوں کی مزاحمت کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہنے والے بہت سے لوگ لالچ اور حرص کا شکار ہو گئے تھے مگر بہت سے دوسرے افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے دوستوں اور حتیٰ کہ دوسرے سماجی طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگیاں بچانے کے لئے خود اپنی، بلکہ اپنے خاندان والوں کی زندگیاں بھی خطرے میں ڈال دی تھیں۔ بعض تو اپنے تحفظ میں آئے ہوئے افراد کی زندگیاں بچانے کے لئے خود بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے''

یاسمین خان کے الفاظ دہراتے ہوئے نندی بالکل مناسب انداز میں بیان کرتا ہے:

> ''اس تاریک پسِ منظر کے ساتھ بہت سے لوگوں نے غیر معمولی

بہادری، جرأت اور انسانی جذبے پر مبنی افعال انجام دیئے۔ بعض افراد نے اپنے دوستوں، ہمسایوں، اور مختلف سماجی طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیاں، خود اپنی زندگیاں داؤ پر لگا کر بچائیں۔ بہت سے لوگوں نے ہمسایوں کو ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا، بے شمار لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دی، دور دراز مقامات پر پھنسے ہوئے لوگوں کو خوراک فراہم کی اور بہت سے افراد کو خطرات سے دور رکھنے کے لئے رات کے گھپ اندھیرے میں سواری فراہم کی یا ان کو بھیس بدلنے میں مدد دی یا پھر مسلح تحفظ فراہم کیا۔''7)

یہاں اس حقیقت کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وقتاً فوقتاً بہت سے لکھاری حضرات، مثلاً خوشونت سنگھ، بلراج ساہنی، کرتار سنگھ دوگل، منٹو اور دیگر نے برصغیر کی تقسیم کے دوران پیش آنے والے بعض مُثبت واقعات اور ان کے المناک نتائج کو ایک ''غیر سیاسی''، ''غیر تاریخی'' اور خالص انسانی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ناگزیر طور پر ایک ظالمانہ منفی پہلو کی بناء پر مثبت پہلو دب کر رہ گیا ہے اور یوں مثبت زاویوں کے حوالے سے ایک سطحی رویے کا اظہار کیا گیا ہے۔

چنانچہ نتیجے کے طور پر بہت سے لوگوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس طرح کے واقعات معمول سے ہٹ کر تھے۔

وسیع لفظوں میں، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تقسیم کے منفی اور تاریک پہلوؤں بشمول بڑے پیمانے پر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے قتل عام اور بہت سے دیگر المناک واقعات، مثلاً خواتین کی عصمت دری، گمشدگی، اور لوٹ مار وغیرہ کو ریڈکلف لائن کے دونوں اطراف مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آنے والی نسلوں کے درمیان نفرت کو فروغ دینے اور انڈیا اور پاکستان کے درمیان ایک مسلسل دُشمنی/مخاصمت قائم رکھنے کے لئے استعمال کیا گیا۔

اس کے باوجود، بعض ایسے مُثبت تجربات کو سرے سے ہی نظر انداز کر دینا جیسے کہ بہت سے مسلمانوں کی طرف سے اپنے غیر مُسلم ہم وطنوں کو سرحد کے اُس پار پہنچانے میں مدد کرنا اور اس طرح دوسری طرف سے تعاون کی مثالیں جو کہ تقسیم کے عمل کے دوران نایاب قسم کی مثالیں تھیں، ایک قسم کی دانش ورانہ بددیانتی ہے۔(8)

ڈاکٹر مبارک علی کی رائے میں:(9)

''فرقہ ورانہ فسادات ایک طرف تو انسانوں کی بربریت کو ظاہر کر رہے تھے دوسری طرف ان فسادات کے دوران ایسے انسانوں کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں جنہوں نے اپنے حواس بحال رکھے اور ایک ایسے ماحول میں بھی معصوم لوگوں کی زندگیاں بچائیں جس میں بربریت کو بہادری کے مساوی گردانا جارہا تھا۔ لہٰذا دونوں پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تاریخ کو ایک وسیع تر تناظر میں لکھنا اور زیرِنظر لانا چاہیے۔''

اس کتاب کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ سرحد کے دونوں اطراف مثبت تجربات کے حوالے سے کیے گئے مکالموں کی ایک فہرست تیار کی جائے جس میں شمالی ہندوستان یعنی دونوں پنجاب، مشرقی پنجاب (بھارت)، مغربی پنجاب (پاکستان) ریاست ہریانہ کے بعض شہروں (جو اس وقت پنجاب کا حصہ تھے) اور دہلی جیسے شہر کی تقسیم پر جہاں سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ہجرت کر گئی تھی اور جہاں مغربی پنجاب سے بہت سے افراد آ کر آباد ہو گئے تھے، توجہ مرکوز کی جائے۔ جب ہم کسی مثبت تجربے کی بات کرتے ہیں تو یہ محض تقسیم کے ساتھ شروع ہو جانے والی نقل مکانی کے دوران کسی نیک کام یا کسی کو بچانے کی کوشش بھی آ جاتی ہیں جن کا مقصد ان افراد اور خاندانوں کی طرف سے برصغیر میں امن کے لئے مُثبت کردار ادا کرنا تھا جو تقسیم کے عمل کے دوران ہونے والے ہولناک فسادات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے باوجود بہتر تعلقات کے حامی تھے۔ اگرچہ انٹرویو کیے جانے والے بعض لوگوں کا تعلق امن کی تنظیموں سے ہے، تاہم باقی لوگ وہ ہیں جو اپنے ترک شدہ یعنی پرانے گھروں کے دورے پر آتے رہتے ہیں۔ اگر ان کا کوئی گھر نہیں تھا تو وہ اپنے پرانے ''دیس'' کی سیر کو ہی آنے کی راہ نکال لیتے تھے۔

ہم یہاں اس امر کو بالکل واضح کر دینا پسند کریں گے کہ جب ہم تقسیم کے مُثبت پہلوؤں کی بات کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تقسیم کے واقعے کو بھول جانا چاہیے یا یہ کہ اس کے ساتھ منسلک صدمے کی اہمیت کم کر دی جانی چاہیے۔ تاہم ایک مرگ انبوہ کے بیج میں کچھ مُثبت مناظر بھی دیکھنے کو ملے تھے۔ اُمید ہے کہ انتہا پسند خیالات رکھنے والی موجودہ نسل ان مُثبت تجربات سے کچھ نہ کچھ سبق ضرور سیکھ سکتی ہے۔

ہم یہاں اس امر کو بھی واضح کر دینا چاہیں گے کہ اگر چہ کتاب کا مقصد پاکستان اور انڈیا کے درمیان امن کو مستحکم کرتا ہے مگر ہماری اس عاجزانہ کوشش کو کسی حساب سے بھی پُرانے دنوں کی حسرتناک یادوں سے تعبیر نہ کیا جائے جو کہ موجودہ سرحدوں کے جواز کو تسلیم کرنے سے انکاری ہوں۔ برصغیر میں بداعتمادی کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ دونوں ممالک کے درمیان افہام و تفہیم کی فضاء قائم کرنے کی کسی بھی کو کو ریاستوں کے دوبارہ الحاق یا سرحدوں کو تبدیل کرنے کے عزائم کے مترادف دانا جاتا ہے۔(10) ہم سب اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں انڈیا کی تقسیم کا مطلب یہ بھی تھا کہ پاکستان کے نام سے ایک آزاد مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

ہم سب اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انڈیا اور پاکستان عمومی طور پر اور دونوں پنجاب خاص طور پر دو ایسے بھائیوں کی طرح ہیں جنہوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ گھر بنا لئے ہیں۔ حتیٰ کہ جب بھائیوں کے درمیان جائیداد کی تقسیم بھی ہو جاتی ہے تو ان کے درمیان پھر بھی تعلقات قائم رہتے ہیں۔ ان کے درمیان تنازعات موجود بھی ہوں تو وہ پھر بھی میل ملاپ جاری رکھتے ہیں جب تک کہ تمام تنازعات حل نہ ہو جائیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اعتزاز احسن صاحب کے اس معقول اور سچائی کے حامل نکتہ نظر سے مکمل اتفاق کرتے ہیں جس کا اظہار اُنہوں نے انڈس ساگا (Indus Saga) میں پاکستان اور انڈیا کے درمیان تفریقات اور مُشترکہ خصوصیات کے حوالے سے بڑے واضح طور پر ان الفاظ میں کہا تھا:(11)

> ''ہوسکتا ہے کہ انڈیا کے لوگ تفریقات سے انکار کرتے رہیں اور پاکستانی مُشترک خصوصیات یا مماثلتوں کو مسترد کرتے رہیں، تاہم تفریق اور مماثلت دونوں ہی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ سمجھنے یا غور کرنے کا نکتہ یہ ہے کہ انڈیا۔ پاکستان کی تقسیم ان تفریقوں یا مماثلتوں کا دونوں طرف احاطہ کرتی ہے اور ہمیں ان دونوں کو خوشی خوشی تسلیم کر لینا چاہیے۔''

اس کتاب کی اشاعت کے پس پردہ بنیادی محرک کے طور پر یہ حقیقت کارفرما تھی کہ اس تکلیف دہ دور میں خونی فسادات کی زد سے محفوظ رہ جانے والے افراد کے لئے تقسیم ابھی تک تنازعے کے بنیادی سبب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ تقسیم کو ایک ایسے

ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا جس کے ذریعے نفرت کے احساسات کو فروغ دیا جائے اور نفرت کے یہی جذبات ابھی تک موجودہ نسل کے ذہنوں پر بھی غلبہ جمائے ہوئے ہیں۔(12)

یہ خطرہ اور امکان ہمیشہ سے موجود رہا ہے کہ اس طرح کی زبانی روایات پر مبنی تاریخ مبالغہ آرائی کی صورت اختیار کر کے معصوم اور کچے ذہنوں کو گمراہ کن نظریات کا شکار کر سکتی ہے۔ اگر چہ فی الوقت دونوں اقوام کے درمیان تعلقات میں بہتری آجانے اور باہمی روابط میں اضافہ ہو جانے کی بناء پر اس رجحان میں کچھ تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے۔ تاہم یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ کچے اذہان کو غلط قسم کے خیالات کی یلغار سے آلودہ نہ کیا جائے اور یہ بھی اہم ہے کہ مستقبل کی نسلوں کو اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ تقسیم سے قبل ان کے آباؤ اجداد کس طرح دوستانہ اور موافق ماحول میں اکٹھے رہ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی تقسیم کے دوران بعض لوگوں کی طرف سے کس طرح بظاہر دُشمن طبقات کے لئے خیر خواہی اور ہمدردی پر مبنی جذبے و عمل کا مظاہرہ کیا گیا اور یہ کہ ایسے واقعات کا جن کو کسی دستاویزی شکل میں محفوظ نہیں کیا جا سکا، پرچار کیا جائے۔

اس کے علاوہ، دونوں ممالک میں بسنے والے خاندانوں پر انمٹ نقوش چھوڑنے کے ساتھ ہی اس تقسیم نے اپنے پیچھے پورے جنوبی ایشیاء کے لئے مجموعی طور پر بھی نفرت اور عدم اعتماد کا ایک مضبوط ورثہ چھوڑا ہے۔

اور تقسیم کے نتیجے میں برصغیر میں تشدد کی روایت بھی پروان چڑھ گئی ہے اور اس کی بنیاد پر بعد میں جاری رہنے والے مذہبی اور فرقہ ورانہ فسادات کا جواز بھی پیدا کیا جاتا رہا۔ اگر چہ گذشتہ چند برسوں کے دوران حالات درست سمت اختیار کرتے نظر آرہے ہیں، تاہم وقتاً فوقتاً سرحد کے دونوں جانب اخباروں وغیرہ میں ایسی سرخیاں لگا دی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں تقسیم کے دور کے دُکھ اور مصائب تازہ ہو جاتے ہیں اور تنازعات و اختلافات دوبارہ سر اُٹھا لیتے ہیں۔ چنانچہ یاسمین خان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:(13)

> ''اگر چہ انڈیا اور پاکستان میں کشیدگی کے خاتمے اور امن کے قیام کے لئے کی جانے والی نئی کوششوں کے حوالے سے اُمید کا اظہار کیا جا سکتا ہے، تاہم ان دو ریاستوں کے ظہور میں آنے کی قیمت ہم بدقسمتی سے باہمی عناد/دشمنی کی صورت میں چکاتے چلے آرہے ہیں۔ 1947ء سے

لے کر اب تک دونوں ملکوں میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ اور مُبینہ سرد جنگ
بھی جاری ہے۔''

خوشونت سنگھ تقسیم کے گہرے اثرات کو بڑے مناسب الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے:

''تقسیم کے زخم تو بھر گئے ہیں مگر اس کے زہریلے اثرات سے ابھی تک
نجات حاصل نہیں کی جا سکی۔''

اس کام یعنی کتاب کو منظر عام پر لانے کے پس پردہ دوسرا اہم محرک وہ ''مشترک'' پنجابی رویے یا اقدار'' ہیں جو تقسیم سے قبل بھی موجود تھیں اور کچھ حد تک ان کا احیاء گذشتہ چند برسوں میں دوبارہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ یہ نکتہ قبل از تقسیم کے ماحول میں بھی اہمیت رکھتا تھا یعنی مذہبی تشخص پر جو کہ دیہی ماحول میں نچلی سطح پر موجود تھی، مُشترکہ قبائلی، خاندانی یا پیشہ ورانہ اور جغرافیائی روابط وروایات کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

ہم اس امر کو جاننے کے شائق تھے کہ آیا تقسیم کے دوران اس قومی وثقافتی بھائی چارے و دوستانہ احساسات پر شدید قوم پرستی اور مذہبی انتہا پسندی کا رنگ مکمل طور پر غالب آ چکا تھا یا ایسا نہیں تھا۔ تحقیق کے دوران جو چیز سامنے آئی وہ یہ تھی کہ بعض لوگوں کے نزدیک مذہب اور قوم پرستی کے تصوّرات بھی پنجابی ثقافت وروایات اور ذیلی شناختوں پر مبنی تعلقات پر مکمل طور پر غالب نہیں آ سکے۔ یہ تعلقات تقسیم کے بعد بھی طویل عرصہ تک برقرار رہتے چلے آ رہے ہیں۔ تقسیم کے حوالے سے تخلیق ہونے والے زیادہ تر ادب میں تقسیم کے دوران ''پنجابی شناخت'' کو مکمل طور پر غیر موثر کر کے رکھ دیا گیا ہے اور عقیدے وقوم پرستی کے جذبات کو غالب ہوتا دکھایا گیا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں یہ کوشش کی ہے کہ ایسی کہانیوں کا تذکرہ کیا جائے جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ حتیٰ کہ تقسیم کے دوران بھی ''پنجابی ثقافت'' پر مبنی بندھن کمزور نہیں پڑے تھے۔ ہمدردی کے جذبات کے علاوہ یہ اس شناخت کی بنیاد پر سامنے آنے والے احساسات ہی تھے کہ بہت سے مسلمانوں نے اپنے دوسرے پنجابی بھائیوں کی جان بچائی اور اسی طرح کے جذبات کا مظاہرہ غیر مسلموں کی طرف سے بھی کیا گیا۔ حتیٰ کہ بدترین وقت کے دوران بھی اس طرح کے بندھن کمزور نہیں پڑ سکے تھے جیسا کہ اس کتاب میں پیش کی گئی کچھ مثالوں سے ثابت ہوگا۔(13)

اس کتاب میں اس حقیقت کے برعکس نکتۂ نظر پیش کرنے یا اس کو مسترد کر دینے کی کوشش

کی گئی ہے کہ تقسیم اور اس کے نتیجے میں دو ممالک کے درمیان پیدا ہونے والی مخاصمت کے منفی اثرات / عواقب سامنے آئے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے دونوں ممالک میں اقلیتوں کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے اور دوسری طرف، چونکہ یہ ایک مذہبی تقسیم تھی اس لئے دونوں ممالک کے تعلقات پر مذہبی رنگ ہمیشہ غالب رہا ہے۔

پاکستان میں بھارت مخالف جذبات کی تشہیر بعض اوقات غیر مسلموں پر قہر توڑنے کے مترادف ہوتی ہے۔ اس نکتے کی ایک وضاحت بابری مسجد کو مسمار کر دیئے جانے کے بعد پاکستان میں غیر مسلموں کے معبدوں / خانقاہوں کو جلا دینے کے واقعات سے ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے کیا گیا کہ انڈیا میں غیر مسلموں کی اکثریت نے بابری مسجد گرا دیئے جانے کے شرمناک واقع کی بالکل حمایت نہیں کی تھی۔ اشتیاق احمد نے بالکل درست کہا ہے کہ: (16)

> ''ایودھیا میں بابری مسجد کی مسماری کے ساتھ ہی غارت گری اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی ظالمانہ ہلاکتوں کے جو واقعات دیکھنے میں آئے، ان پر پاکستان میں شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ ہندوؤں کے اثاثوں اور مندروں کو تباہ کرنے کے ساتھ ہی خاص طور پر سندھ اور اس کے ساتھ ہی بلوچستان میں بھی بے شمار ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔''

بالکل اسی طرح پاکستان مخالف جذبات کی تشہیر بھی دائیں بازو کے ان انتہاء پسندوں کی اسلام مخالف تشہیر کا حصہ بن جاتی ہے جو انڈیا کے مسلمانوں کو شدید شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آر ایس ایس (راشٹریہ سوک سنگھ) کی انڈیا کے مسلمانوں کے لئے نفرت اور شک وشبہ کوئی راز نہیں ہے اور 1947ء کے فرقہ ورانہ فسادات کو بہانہ بنا کر وقتاً فوقتاً انڈیا کے مسلمانوں سے نفرت کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی اُنہیں ہلاک کر کے رکھ دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ (17)

شک وشبہے کے اس رجحان میں بابری مسجد کو مسمار کر کے رکھ دیئے جانے کے بعد اور بھی تیزی آ گئی اور یہ اُس وقت اپنی نچلی ترین سطح پر پہنچ گیا جب 2002ء کے فسادات اور اس کے بعد اکتوبر 2002ء میں گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر امودی کی اس انتخابی مہم کے دوران بے شمار بے گناہ مسلمانوں کو ہدف بنایا گیا جس میں مسلمانوں کے قوم پرستانہ عزائم پر اعتراض کرنے کے ساتھ انہیں پاکستان کے لئے کام کرنے والے خفیہ عناصر تک قرار دینے سے گریز نہ کیا گیا۔ اگرچہ

یہ ساری کارروائیاں ابھی حال ہی میں دیکھنے میں آئی ہیں تاہم یہ بات بھی سُننے میں آتی رہتی ہے کہ انڈیا میں بے شمار انتہا پسند ہندوؤں کی رائے میں 1947ء کی تقسیم نامکمل تھی اور یہ کہ انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں کو واپس پاکستان چلے جانا چاہیے۔

اگر چہ گذشتہ چند برسوں کے دوران اقلیتوں کی صورتحال میں کچھ بہتری دیکھنے میں آئی ہے، تاہم ابھی وہ منزل بہت دور ہے جہاں پہنچ کر دونوں ممالک کی اقلیتوں کے اندر تحفظ کا احساس اُجاگر ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کا احساس کرنے کی ہے کہ تقسیم ہند کے دوران ہونے والے فسادات مذہبی، تفریقوں یا اختلافات کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ سیدھی سادھی حقیقت یہ ہے کہ یہ فسادات خطہ چھوڑ کر جانے والی غیر اخلاقی تو آبادیاتی طاقت کی طرف سے ایک بھولی بھالی قیادت کے ذریعے نارضامند لوگوں پر مُسلط کر دیئے گئے تھے اور بے دلی کی صورتحال میں انہیں نیچے سے بھڑکایا گیا تھا۔'' (18)

ایک دوسرے کے ممالک کے کثرت سے کئے جانے والے دوروں کے دوران ہم سب کو تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے گہرے مذہبی تعصّبات اور مخاصمتوں کا اچھی طرح تجربہ ہے۔ ہماری جتنے بے شمار افراد سے ملاقات ہوئی ہے ان سب نے یہی اظہار خیال کیا ہے کہ تقسیم کے زخم کبھی مندمل نہیں ہو سکتے اور یہ بھی کہ اس دور کی ہولناک یادیں ان کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہیں گی۔ پرانی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا پُختہ یقین تھا کہ اس دور میں کئے جانے والے ہولناک جرائم پر اگر دونوں ممالک ایک دوسرے سے معافی مانگ لیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہوگی۔ انڈیا کی صورتحال بھی کسی طرح سے مختلف نہیں ہے کیونکہ پاکستان سے ہجرت کر کے چلے جانے والوں کو ابھی تک تقسیم کے نتیجے میں ملنے والے صدمات بھلانے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ انڈیا میں اس طرح کے تبصرے عام ہیں کہ ''مسلمانوں پر بالکل اعتماد نہیں کیا جا سکتا'' اور اسی طرح کے تبصرے پاکستان میں ہندوؤں کے بارے میں کئے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کی سوچ کے مطابق تقسیم کے واقعات بالکل فطری قسم کے لگتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلم، غیر مسلم مخاصمت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ انڈیا اور پاکستان دونوں جگہوں پر دوستوں کے ساتھ ہماری جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں ان میں بار بار یہی بات دہرائی گئی کہ ''ہم ہمیشہ سے مختلف ہیں اور رہیں گے۔ مسلمانوں کا ہاتھ دھونے کا طریقہ ہندوؤں سے مختلف

ہے، دونوں کا روٹی پکانے کا انداز مختلف ہے اور آخری مگر مساوی اہم بات یہ کہ ان کا عبادت کا طریقہ بھی مختلف ہے۔'' بہت سے ہندو مسلمانوں کو محض جنونی ہی سمجھتے ہیں اور بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ اختلافات ناقابل حل ہیں۔

اگر چہ یہ کتاب دونوں ممالک کے اندر بسنے والی اقلیتوں کے مسائل کا حل نہیں ہے، یا پھر یہ حقیقت کہ دونوں ممالک کے درمیان اصل مسئلہ مذہبی مسئلہ ہی گردانا جاتا ہے، مگر ہمارا یقین ہے کہ یہ دو لحاظ سے معاون ثابت ہوگی۔ ایک تو یہ کہ ہماری مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں جہاں ایک طرف دیوانگیوں یا جنون کا مظاہرہ کیا جارہا تھا، وہاں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے مخالف فرقے کے لوگوں کی جانیں بچائیں، جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب تمام افراد کے لئے بنیادی یا فیصلہ کن قسم کا عنصر نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت عروج پر تھی تو نہ صرف انفرادی حوالوں سے بعض لوگوں نے اپنی جان اور ساکھ خطرے میں ڈال کر دوسروں کو تحفظ دیا بلکہ بہت سے مواقع پر مذہبی خانقاہوں/درگاہوں کو بھی دوسرے یا مخالف فرقے کے مردوں اور عورتوں کو پناہ دینے کے لئے استعمال کیا گیا۔ نمایاں اہمیت کی مثالوں میں بہت سی مسجدوں اور گوردواروں (سکھ عبادت گاہیں) کو غیر مسلموں اور مسلمانوں دونوں کو پناہ دینے کے لئے استعمال کیا گیا اور کچھ مولویوں نے سکھوں کو جبکہ کچھ سکھ مبلغوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ (19) سب سے زیادہ دلچسپ مثالیں ان مسلمان اور سکھ خواتین کی ہیں جنہیں ایک دوسرے کی عبادت گاہوں/مقدس مقامات میں پناہ دی گئی تھی۔

اس حقیقت کو کہ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کی خواتین کے تحفظ کے لئے استعمال کیا گیا تھا، اتنے نمایاں طور پر اُجاگر نہیں کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس امر کو بھی ثابت کرتی ہے کہ بعض اخذ کردہ نتائج آج کی دنیا میں بھی اسی قدر موزوں اور مفید ہیں جو مذہبی جہالت اور جنونیت کی لپیٹ میں آچکی ہیں۔ اگر چہ فسادات کے دوران وحشت یا درندگی کے مظاہروں کے حوالے سے بہت سی نظریاتی وضاحتیں موجود ہیں جبکہ نام نہاد دُشمن کو بچانے کی مثالوں کے لئے ایسی کوئی وضاحتیں/نظریات پیش نہیں کئے گئے، شاید زندہ بچ جانے والے افراد کے احوال کے تفصیل کی سب سے قریبی جھلک عیسائی لوگوں کی طرف سے جان بچانے کی کوششوں یا مثالوں میں نظر آتی ہے۔ (20)

اس کتاب میں شامل مکالموں یا سوال و جواب کے سلسلوں سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ مالوندر جیت سنگھ وڑائچ جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے عزیز واقرباء کی قربانیاں دینے کے باوجود تقسیم کو کبھی بھی مسلم۔غیر مسلم کی لڑائی کے زاویے سے نہیں دیکھا۔وڑائچ کو یہ احساس بھی بہت جلد ہو گیا تھا کہ یہ لاتعلقی یا بیگانی کا عنصر ہی تھا جو قتل و غارت کا ذمہ دار تھا نہ کہ کوئی فرقہ بحیثیت مجموعی۔(21) یہ بہت اہم پہلو ہے کیونکہ 1947ء کی تنگ نظرانہ تاریخ کو بڑی آسانی سے زیادہ تر دونوں ممالک میں غلط فہمیاں پھیلانے کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ بچوں کے ذہنوں میں یہی بٹھایا جاتا ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد، کو مخالف مذہب کے لوگوں نے ہی قتل کیا تھا اور یوں انڈیا میں ان کو مسلمانوں سے اور پاکستان میں غیر مسلموں سے نفرت کا جواز فراہم کیا جاتا ہے۔

دونوں ممالک میں ''مسلم ..... غیر مسلم'' مخالفت یا مخاصمت ختم کرنے کے لئے دونوں ممالک اور سماجی طبقات کے درمیان سکھوں کو ایک پُل کے طور پر استعمال کرنے کے تصور پر خاطر خواہ تحقیق نہیں کی گئی اور اب اس پہلو کی طرف صرف حالیہ برسوں میں ہی توجہ دی گئی ہے۔چنانچہ کتاب میں دیئے گئے انٹرویوز یا سوال جواب پر مبنی مکالموں میں اس پہلو کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس کے نتیجے میں مسلم۔غیر مُسلم مخالفت میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور آئی ہے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ سکھوں کے بطور ایک رابطہ پُل کے سامنے آنے سے گذشتہ چند برسوں کے دوران حالات میں کافی بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔اس طبقے یعنی سکھوں کے مُقدس مقامات پاکستانی پنجاب میں واقع ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے مسلمان بھی سکھ مذہب کے بانی بابا گورو نانک دیو سے عقیدت رکھتے ہیں۔حال ہی میں بہت باریک کندہ کاری کرنے کے ماہر ارشد مغل نے، جو کہ لاہور میں رہائش پذیر ہے، بابا گورو نانک جی کی ایک بہت ہی چھوٹی تصویر بنائی ہے جو فلم کی نوک کے نشان سے زیادہ بڑی نہیں ہے۔وہ 1947ء میں تقسیم کے دور میں پیدا ہوا تھا اور اندرونِ لاہور کے پُرانے علاقے رہائش رکھتا ہے۔لندن میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے دفتر نے بھی اس کے کام بہت دلچسپی سے دیکھا اور تسلیم کیا ہے، اور اس کے کام کو سراہتے ہوئے اُنہوں نے 2008ء میں اس کے نام کو ورلڈ ریکارڈ کی فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس کی خواہش ہے کہ وہ بھارت کا دورہ کرے تا کہ وہاں اپنے شاہکاروں، خاص طور پر بابا

گورونانک والی تصویر کی نمائش کر سکے اور یوں انڈیا کے عوام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ایک پاکستانی مسلمان نے کس طرح گورونانک کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔(22)

سکھوں کی طرف سے اپنے مقدس مذہبی مقامات اور پُرانی رہائش گاہوں کے دوروں نے بھی نہ صرف دونوں پنجابوں کے مابین تعلقات بہتر بنانے میں بلکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان سرد مہری کے خاتمے کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ بالکل بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ:(23)

> ''سکھوں کو پاکستانی پنجاب سے ایک خاص محبت ہے کیونکہ ان کے سب سے مقدس مقامات یعنی ننکانہ صاحب، حسن ابدال کا پنجہ صاحب اور سیالکوٹ کی بابے دی بیری، پاکستان میں واقع ہیں۔''

اگرچہ ہمیں اس امر کا پوری طرح احساس ہے کہ یہ کتاب دونوں مذاہب کے لوگوں کے درمیان عدم اعتماد کے خاتمے میں اتنا اہم کردار تو ادا نہیں کر سکتی، تاہم دونوں ممالک کی مشترکہ ثقافتوں اور سکھ مذہب کے کردار کو نمایاں کرنے سے شکوک وشبہات کے گہرے اثرات میں یقیناً کمی لائی جا سکتی ہے۔

مُسلم اور غیر مسلم کی درجہ بندی بہت وسیع ہے کیونکہ بہت سے غیر مسلم جتنی مُشترک خصوصیات مسلمانوں کے ساتھ دیکھتے ہیں اتنی وہ خود اپنے طبقے کے ساتھ بھی محسوس نہیں کرتے اور اسی طرح یہ بات اُلٹ طور پر بھی درست ہے۔ ڈی جی کھوسہ نے دونوں مذاہب کے لوگوں کے درمیان اختلافات کا جس طرح مختصر مگر جامع احاطہ کیا ہے اس پر نظر ڈالنا آج کے حالات میں بھی مفید رہے گا۔(24)

> ''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اور غیر مسلمان طبقات کے درمیان ہمیشہ سے عقائد، معمولات اور انداز نظر کا فرق موجود رہا ہے: مگر یہ نکتہ بھی مساوی طور پر درست ہے کہ یہ اختلافات ایک انفرادی شخصیت کے اظہار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، جیسا کہ ایک ہی خاندان کے افراد میں کچھ ایسی منفرد خصوصیات اور خوبیوں کا موجود ہونا جو اسے دوسرے خاندان سے ممتاز کر دیں مگر اس فرق کا اتنی شدت سے

نمایاں نہ ہونا کہ اس کے نتیجے میں دُشمنی یا مخاصمت پیدا ہو جائے۔''

اور اگر چہ یہ کتاب کسی طرح کے معافی نامے کے زمرے میں نہیں آتی مگر یہ کچھ حد تک یہ ضرور ثابت کرتی ہے کہ اجتماعی معافی اس لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ جن لوگوں نے دوسروں کی زندگیاں بچائیں انہوں نے خود اپنی جانوں کو بھی خطرے مین ڈال دیا تھا اور صاف ظاہر ہے کہ اُنہوں نے اس امر کی بھی پرواہ نہ کی کہ اس وقت ان کے اردگرد بھی کیا ہو رہا تھا۔ یہ حقیقت کہ ہم اُس وقت ایک مُشترکہ منصوبے پر عملدرآمد کے دوران سرحد کے دونوں طرف انفرادی شخصیات کے مثبت تجربات سے استفادہ کر سکتے تھے ہمارے لئے بہت ہیجان خیز تھی، خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جبکہ ہم نے آزادی کی ساٹھ سالہ تقریبات کا اختتام ہی کیا تھا۔

آخر میں ہم یہ کہنا پسند کریں گے کہ دونوں ممالک کے درمیان امن کی کوششوں کے نتیجے میں پاکستانیوں اور بھارتیوں کے درمیان تعاون کے عمل کو آگے بڑھانے میں مدد ملی ہے، اور سرحد کے دونوں اطراف کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے بلکہ اُنہوں نے دونوں ممالک کے افراد کے مابین پائے جانے والی غلط فہمی کی وجوہات کا تجزیہ کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ عمل کی کوشش اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوگئی ہیں جہاں دونوں اطراف کے لوگ تقسیم کے موضوع پر گفتگو کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں جو کہ اب سے کچھ عرصہ قبل بہت نازک موضوع تصوّر کیا جاتا تھا۔ پچھلی نسل کے لوگوں کے مابین روابط 1950ء کی دہائی میں شروع ہوئے تھے مگر محض سطحی نوعیت کے ہونے کے ساتھ ہی اندرونی تعصّبات سے پڑ تھے۔ اب تعلقات ارتقاء پذیر ہونا شروع ہوگئے ہیں اور تقسیم کے موضوع پر بڑی بے تکلفانہ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دونوں ممالک کے شہریوں کے مابین پائی جانے والی غلط فہمیاں دور کی جاسکتی ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ عاجزانہ کوشش دو سابقہ دُشمنوں کے درمیان امن کے قیام کے حوالے سے معاون ثابت ہوگی۔

## تقسیم کا ادب

تقسیم پر لکھی جانے والی تحریروں کی درجہ بندی دو قسم کے رجحانات کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ ایک تو بنیادی طور پر تاریخی نوعیت کی ہے۔ پہلی صنف میں آنے والی تحریریں برصغیر کی تقسیم

کے موضوع کو سیاسی تناظر مین زیر بحث لاتی ہیں، یعنی ''کانگریس اور لیگ'' کی باہمی مخاصمت کی بنیاد پر۔ ادب کی صنف دونوں ممالک کی طرف سے معقولیت پر مبنی رویے کو پروان چڑھانے کی ٹھوس کوششوں کے نتیجے میں منظر عام پر آئی۔ یاسمین خان نے اس حوالے سے بالکل درست اظہار خیال کیا ہے کہ(25)

''آزادی کے فوراً بعد ہی سرحد کے دونوں اطراف تاریخ لکھنے کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا جس میں ان (بھارتی اور پاکستانی) قوم پرستانہ لہروں کو سیدھا مقصدیت کے ایسے فلسفوں میں سمو کر رکھ دیا گیا جنہیں ابھی بھی جنوبی ایشیائی شہروں کے قومی عجائب گھروں میں سیاہ وسفید تصویروں کی نمائش میں یا پھر اسکول کے بچوں کی تاریخ کی کتابوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں ریاستیں اپنی خودنمائی کے کام میں پیش پیش ہیں۔''

اگر تقسیم کے واقعات کو دستاویزی شکل میں محفوظ رکھنے کا آغاز کرنے والی تحریروں کا نام لیا جائے تو پینڈرل مون، جی ڈی کھوسلہ، ایم ایس رندھاوا، آسٹیان ٹالبوٹ، رگھوویندر اتنواز اور یاسمین خان کا نام سرفہرست آتا ہے۔

دوسری صنف میں تقسیم سے متعلق افسانوی تحریریں آجاتی ہیں، یعنی کرتار سنگھ دوگل کی تحریں، منٹو اور خوشونت سنگھ کی ''ٹرین ٹو پاکستان'' جن کا شمار رجحان ساز تحریروں میں ہوتا ہے، تقسیم کے انسانی پہلو کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اسی طرح بہت سی فلمیں جیسے کرتار سنگھ (پاکستان) اور پنجر (انڈیا) وغیرہ بھی تقسیم کے دُکھوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

برصغیر سے باہر اس حوالے سے دو اصناف نمایاں ہیں۔ ایک تو سنجیدہ قسم کی علمی کوششیں جیسا کہ ٹالبوٹ کی حالیہ کاوشوں سے ظاہر ہوتا ہے جس کی خضر حیات ٹوانہ اور امرتسر پر کتابیں کسی بھی فرد کے لئے جو تقسیم کے موضوع میں دلچسپی رکھتا ہو ہر لحاظ سے شاہکار تصانیف ہیں اور یاسمین کی ''دی گریٹ پارٹیشن''۔ اس کے علاوہ دوسری بہترین کاوشوں میں جن کے اندر کچھ انسانی پہلو نمایاں ہے جنوبی ایشیاء سے تعلق رکھنے والے ان لکھاریوں کا کام آجاتا ہے جیسے شونا سنگھ بالدونِ، میرا سیال اور بیپسی سدھوا وغیرہ جنہوں نے تقسیم کے کچھ مسحور کُن پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

ان تمام تخلیقات کی ایک اپنی اہمیت ہے اور ان کی مدد سے ہمیں تقسیم ہند کو ایک سیدھے سادھے تناظر میں دیکھنے اور ان لوگوں کا دُکھ اور درد سمجھنے میں بھی مدد ملی ہے جنہیں نہ صرف جان

اور مال کا نقصان برداشت کرنا پڑا بلکہ اس کے ساتھ ہی بیدخلی اور بے بسی کا تکلیف دہ احساس بھی۔ یہ ایک طرح سے ان کے دُکھوں کے اظہار کے ذریعے جذباتی آسودگی (Catharsis) یا زخموں کو مندمل کرنے کا ذریعہ بھی ہے جو کہ تکلیف کا احساس دور کرنے میں ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

## حکمتِ عملی اور مثالی نمونے

یہ کتاب سوال و جواب کی صورت میں مکالموں کے ایک سلسلے پر مشتمل ہے۔ اس مقصد کے لئے لوگوں کا چناؤ کسی مخصوص ترتیب یا درجہ بندی کے تحت نہیں کیا گیا اور اس طرح کے لوگوں کی ایک منظّم فہرست کا حصول انتہائی مُشکل تھا کیونکہ 1947ء کے خونی فسادات کے دوران پیش آنے والے مُثبت تجربات یا واقعات کے حوالے سے کوئی باقاعدہ دستاویزات موجود نہیں ہیں، اگرچہ بہت سی کتابوں میں چند ایک ایسی انفرادی شخصیات کے نام موجود ہیں جن میں سے اب بہت کم بقید حیات ہیں۔ ہم نے اپنے دوستوں کی مدد سے زندہ بچ جانے والی چند ایک ایسی شخصیات کا پتہ چلا لیا جو کہ مُثبت قسم کے تجربات سے گزر چکے تھے اور پھر ان شخصیات کی وساطت سے ہمارا اس طرح کے اور افراد سے بھی رابطہ ہوا جو تقسیم کے دوران فسادات کی نذر ہونے سے بچ گئے تھے۔

بہت سے لوگوں کی مدد اور رہنمائی کے ساتھ ہی چند ایک مجبوریوں یا رکاوٹوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جن لوگوں کا انٹرویو کیا گیا ہے وہ تقسیم کے وقت مختلف قسم کے پس منظر سے تعلق رکھنے کے علاوہ مختلف عمروں کے تھے۔ بعض کا تعلق دیہی علاقوں سے تھا اور بعض شہری علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، بعض دوسروں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور بعض ایسے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کی جانیں بچائی تھیں چند ایک ایسی عورتیں بھی تھیں جنہوں نے چشم دید واقعات بیان کئے۔

تاہم ایک نکتہ جو ان سب مکالموں میں نمایاں تھا وہ یہ تھا کہ سب لوگوں نے انڈیا اور پاکستان کے درمیان پُرامن تعلقات کی خواہش کے ساتھ ہی اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ تقسیم کے واقعات کو برصغیر میں دُشمنی یا مخاصمت میں اضافے کا سبب بنانے کی بجائے ان سے سبق سیکھا جائے۔

ہمیں ان کی شاندار یادداشت نے بہت متاثر کیا۔ گمبھیر معاملات کی سمجھ اور اس کے ساتھ

ہی ان کے حساس قسم کے واقعات کا تجربہ کرنے کی صلاحیت بہت سے مؤرخین کو شرمسار کر دینے کے لئے کافی تھی، تاہم میں اس نکتے کا اضافہ بھی کرتا چلوں کہ زبانی تاریخ بعض اوقات مختلف وجوہات کی بناء پر غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اس حوالے سے پہلی دلیل یہ دی جاسکتی ہے کہ جن افراد کا انٹرویو کیا گیا وہ مُثبت یا منفی قسم کے تعصّبات کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسانی یادداشت میں صرف وہی واقعات یا حقائق محفوظ رہ جاتے ہیں جنہیں موزوں یا اہم گردانا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ ایک فرد بعض معاملات پر کسی بھی وجہ سے اظہار خیال کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرسکتا ہے۔ اور حتمی نکتہ یہ کہ حقائق کے اوپر پُرانی یادوں کی کسک یا حسرتنا کی غالب آسکتی ہے۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ انٹرویو دینے والی شخصیت حقیقت سے قریب ترین رائے کا اظہار کرے اور بعض ناخوشگوار پہلوؤں کو سامنے لانے میں انکی ہمت افزائی کرنی پڑی۔ یہ طریقہ اس لئے بھی معاون ثابت ہوا کہ ہمیں جو بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ ان نظریات اور نمونوں سے مکمل طور پر مطابقت کی حامل نظر آتی تھی جو ہماری تحقیق کے نکتہ نظر سے اہمیت رکھتے تھے۔

## انڈیا میں رہنے والوں کے انٹرویو

انڈیا کی طرف سے ہم نے تقسیم کے فسادات کی غارتگری سے بچ جانے والے ایسے افراد کے انٹرویو کئے جنہیں یا تو بچالیا گیا تھا یا جنہوں نے دوسروں کو بچانے میں مدد دی تھی۔

یہ افراد جو امرتسر، دہلی، کروکشیترا، لدھیانہ اور چندی گڑھ میں آباد ہو چکے ہیں دراصل پاکستان کے شہروں مثلاً گوجرانوالہ، سرگودھا، لاہور، کہوٹہ، راولپنڈی، بہاولپور اور سیالکوٹ سے ہجرت کر کے گئے تھے۔ یہ امر فائدہ مند رہے گا کہ امرتسر، دہلی، چندی گڑھ، لدھیانہ اور کروکشیتر کا مختصر پس منظر یہاں بیان کر دیا جائے۔

### امرتسر

اپنے جڑواں شہر لاہور سے محض 30 میل کے فاصلے پر امرتسر شہر بہت ہی دلچسپ منظر پیش کرتا ہے، کیونکہ یہاں سے بہت سے مسلمان ہجرت کر گئے تھے جبکہ یہ غیر مسلم پناہ گزینوں کے لئے بھی ایک عبوری منزل یا پڑاؤ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم نے امرتسر میں جن چار افراد کا انٹرویو کیا

ان میں سے تین سرگودھا، جہلم اور لائل پور سے ہجرت کر کے آئے تھے جب کہ ایک کا تعلق بذات خود ضلع امرتسر سے ہی تھا۔

سکھوں کے مقدس مذہبی مقام، گولڈن ٹمپل کا گڑھ، امرتسر تحقیق کے کام کے حوالے سے ایک اہم مقام کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں پر تقسیم کے وقت مسلمانوں کی کثیر آبادی ہونے کی وجہ سے (جو کہ یہاں کی کل آبادی کا 49 فی صد تھے) وسیع پیمانے پر فسادات دیکھنے میں آئے تھے۔ فسادات کی پہلی لہر خضر حیات ٹوانہ کے استعفیٰ اور ماسٹر تارا سنگھ کی طرف سے پاکستان کے قومی جھنڈے کو پھاڑ کر رکھ دینے والے واقعات کے بعد شروع ہوئی تھی جس کے بعد یہ پھیل کر ملتان اور راولپنڈی تک جا پہنچی تھی۔(26)

فسادات کی اس پہلی لہر پر تبصرہ کرتے ہوئے پینڈرل مون یوں گویا ہوتا ہے:(27)

''بلوائیوں کو اس تجارتی شہر کے اندر 24 گھنٹے سے بھی زیادہ وقت کے لئے غارتگری اور لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔ بہترین بازار دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن گئے اور بلوائیوں کو مارنے کے لئے ایک گولی بھی نہیں چلائی گئی۔ مون ایک دلچسپ نکتہ عیاں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس لہر کے دوران انتظامیہ فسادات کی روک تھام کے حوالے سے مکمل بے بس تماشائی بنی رہی۔''(28)

جب فسادات کی اس لہر میں عارضی طور پر کچھ کمی آئی تو اس دوران سرحد کے دونوں طرف بسنے والے پنجابی لوگوں کو خطرے کا احساس ہو جانے کے ساتھ ہی انتظامیہ کو بھی ادراک ہو جانا چاہیے تھا کہ حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حالات مزید بگڑ گئے اور بہت سے مسلمانوں نے دوسرے علاقوں، مثلاً رام باغ گیٹ، رسالپور، اور شریف پورہ منتقل ہونا شروع کر دیا۔(29) آئیان ٹالبوٹ اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''موخر الذکر قصبہ (شریف پورہ) جو کہ جالندھر جانے والی جی ٹی روڈ پر ایک نئی نواحی آبادی تھی، مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں ان کی آبادی 2500 کے لگ بھگ تھی۔ اس آبادی میں ڈرامائی طور پر، پناہ گزینوں کے آنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا۔ 24 مئی کو سکھوں نے رسالپور پر بموں، دھماکہ خیز دستی مواد اور لڑکوں کی مدد سے رسیالپور پر بڑے پیمانے کے حملے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔''(30)

فسادات کی یہ لہر ستمبر تک جاری رہی، ہلاکتوں کے علاوہ، جائیدادوں/املاک کو بھی بڑے پیمانے پر نقصان پہنچایا گیا اور امرتسر کو شریف پورہ، خالصہ کالج، دی ہارنیس اینڈ سیڈلری فیکٹری اور گوبند گڑھ میں قائم کردہ مہاجر کیمپوں کی صورت میں بہت بڑے بوجھ کا سامنا کرنا پڑا۔(31)

مابعد تقسیم کے ادوار میں امرتسر نے انڈیا اور پاکستان کے درمیان تعلقات کے حوالے سے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی کیونکہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

## دہلی

دہلی کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کیونکہ یہاں ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ درحقیقت لاہور کے تجارتی طبقوں نے دہلی منتقل ہونے کو ہی ترجیح دی تھی کیونکہ اب وہ دوبارہ کسی طرح کی تکلیف برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ امرتسر کو محفوظ نہیں تصور کیا جا رہا تھا اور نہ ہی کسی کو یہاں کوئی مستقبل نظر آ رہا تھا کیونکہ یہ سرحد کے قریب واقع تھا دتا (Datta) کے مطابق:

> ''بعض مالدار کاروباری افراد جو پاکستان سے ہجرت کے یہاں آئے تھے، یوں گویا ہوئے: ہم اور کہاں جا سکتے تھے؟ امرتسر سرحد کے قریب تباہ حال ہو رہا تھا، لدھیانہ اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ انبالہ میں پانی دستیاب نہیں تھا۔ صرف دہلی ہی واحد انتخاب رہ گیا تھا کیونکہ یہ دارالحکومت بھی تھا اور اس کے ساتھ ہی تجارتی مرکز بھی۔''(33)

ہم نے دہلی میں جن افراد کا انٹرویو کیا ان میں سے اندرا کٹھپالیا بہاولپور سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا جبکہ دوسری شخصیت ہربھجن سنگھ کا تعلق منٹگمری سے تھا جو اب ساہیوال کہلاتا ہے۔ جبکہ تیسری شخصیت ڈاکٹر رینو کا سنگھ کی پیدائش تقسیم کے بعد کی ہے مگر اس کے والد بھاپا ریم سنگھ کا تعلق نارووال سے اور اُنہوں نے تقسیم کے بعد دہلی رہائش اختیار کر لی تھی۔

## چنڈی گڑھ

چندی گڑھ نے مشرقی پنجاب کے نئے دارالحکومت کی شکل اختیار کرنی تھی کیونکہ اب لاہور مغربی پنجاب کا دارالخلافہ بن چکا تھا۔ اس کا ڈیزائن /خاکہ لی کوربزیئر (Le

(Corbusier نے 1965ء میں تیار کیا تھا اور اب یہ پنجابی لوگوں خاص طور پر کاشتکاروں اور ریٹائرڈ آرمی افسروں کے لئے ایک مقام اتصال یا میل ملاپ کی جگہ بن چکا ہے، جن کی اکثریت کا تعلق اصل میں مغربی پنجاب سے ہے۔ انٹرویو کئے جانے والے تین افراد کا تعلق کہوٹہ، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ سے تھا۔

## لدھیانہ

لدھیانہ اس لحاظ سے اہم تھا کیونکہ مسلمانوں کی کافی تعداد نے لدھیانہ۔ فیروز پور۔قصور کے راستے ہی یہاں سے ہجرت اختیار کی تھی اور اس کے علاوہ مغربی پنجاب سے بھی بہت سے مہاجرین نے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہاں مسلمان کثیر تعداد میں آباد تھے اور 1941ء میں ان کی آبادی 482، 203 کے لگ بھگ تھی۔ وِردی کے مطابق (34):

''لدھیانہ مہاجرین کے لئے مرکزی مقام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس کا رابطہ تمام بڑے شہروں، بشمول دہلی، امرتسر اور لاہور سے استوار تھا اور اسی لئے ہجرت کا سفر کرتے ہوئے مہاجرین کے لئے ایک اہم پڑاؤ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو لوگ پیدل قافلوں کی صورت میں چل رہے تھے اُن کے لئے بلوکی کا راستہ مناسب تھا، خاص طور پر لدھیانہ، فیروز پور، قصور روڈ، یہاں پر فسادات دراصل اس وقت شروع ہوئے تھے جب مہاجرین نے یہاں قیام کے لئے پہنچنا شروع کر دیا اور انتقام کی خواہش شدّت اختیار کر گئی۔ لدھیانہ میں مسلمانوں کے لئے 6 عدد کیمپ لگائے گئے تھے اور اکتوبر 1947ء تک یہاں مسلمانوں کی تعداد میں اچھا خاصہ اضافہ ہو چکا تھا۔ بعض مسلمانوں کی مہاجر کیمپ میں ہندو بھی دیکھ بھال کرتے رہے۔'' (35)

یہاں ہم نے جن افراد کا انٹرویو کیا وہ سرگودھا کے ضلع خوشاب سے ہجرت کر کے لدھیانہ پہنچے تھے۔

## کروکشیتر

کروکشیتر بھی تحقیق کے نقطۂ نظر سے دلچسپی کا عنصر رکھتا تھا کیونکہ یہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد امن وچین سے رہ رہی تھی مگر یہاں مغربی پنجاب سے آنے والے شرنارتھیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی تھی جس نے مقامی آبادی پر دباؤ ڈالا کہ وہ مسلمانوں کو سبق سکھائیں۔ (36)

ذیل میں دیئے گئے جدول میں ایسے افراد کے انٹرویو کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں جن کی زندگیاں بچانے میں دوسرے فرقے کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا تھا یا پھر اس کے برعکس انہوں نے دوسرے فرقے کے لوگوں کی جان بچائی تھی۔ اس جدول میں دوسرے انٹرویو شامل نہیں کئے گئے۔

جدول نمبر 1: انڈیا میں مُثبت تجربات بات کرنے والوں کا انٹرویو:

کل کئے گئے انٹرویو: 12

خود اپنی ذات کے حوالے سے تجربہ کرنے والے: 07

خاندان کے دیگر افراد کے تجربات: 05

تقسیم کے وقت عمر:

05 تا 10 برس: 4

15 تا 20 برس: 3

20 تا 25 برس: 3

تقسیم کے بعد کی پیدائش: 2

## انٹرویو کے موجودہ مقامات

دہلی: 03

چندی گڑھ: 03

کروکشیتر: 01

لدھیانہ: 01

امرتسر: ۴۰

## جن مقامات سے آئے تھے:

بہاولپور: 01

کلکتہ: 01

گوجرانوالہ: 01

سرگودھا:02

منٹگمری:01

لاہور:01

جہلم:01

غیر مہاجر:

امرتسر:01

کرکشیترا:01

پاکستان کا دورہ کرنے والے:09

اس حصے میں مہاجرین کی آمد کے معیار کو بنیاد نہیں بنایا گیا بلکہ مثبت تجربات کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں من مانے طریقے سے چناؤ کرنے کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے، تاہم ہماری یہ کوشش بھی رہی ہے کہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ جن لوگوں کو انٹرویو کے لئے منتخب کیا گیا ہے اُن کے سرحد کے دوسری طرف روابط برقرار ہیں اور اُنہوں نے دوستی کے سلسلے بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔

میں اس امر کا ذکر بھی پسند کروں گا کہ جدول میں ظاہر کئے جانے والے انٹرویوز کے علاوہ ہم نے قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم دونوں ادوار میں فسادات کی لپیٹ میں آنے سے بچ جانے والے ایسے افراد کے انٹرویو بھی کئے ہیں جن سے ہمیں تقسیم کے قبل کے دور کے ماحول کے حوالے سے دلچسپ معلومات حاصل ہوسکتی تھیں، اور بعض ایسے افراد کے انٹرویو بھی کئے گئے ہیں جنہوں نے تقسیم کا دور تو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر جو اس دور کے فسادات کی کہانیاں سن سُن کر جوان ہوئے ہیں۔

پاکستان کی طرف سے ہم نے لاہور، قصور اور فیصل آباد کے لوگوں کے انٹرویو کئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد نے غیر مسلموں کی زندگیاں بچائیں جبکہ بعض ایسے افراد جو امرتسر، انبالہ اور گرگاؤں سے آئے تھے ان کی زندگیاں غیر مسلموں نے بچائی تھیں۔

جدول نمبر2: پاکستان کی طرف مثبت تجربات کرنے والوں کا انٹرویو:

کل تعداد:11 (گیارہ)

خود اپنی ذات کے حوالے سے تجربہ کرنے والے:08

خاندان کے وہ افراد جنہوں نے دوسروں کی زندگی بچائی یا خود ان کی اپنی زندگی بچائی گئی:

03

## تقسیم کے وقت عمر

05 تا 10 برس: 03

25 تا 30 برس: 02

10 تا 15 برس: 02

20 تا 25 برس: 03

تقسیم کے بعد کی پیدائش: 01

## انٹرویو کے مقامات

لاہور کا انتخاب کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ تقسیم سے قبل لاہور شمالی بھارت کے اقتصادی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے بھی اہم یہ کہ لاہوری معاشرہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی سرگرمیوں کے ملاپ کا آئینہ دار تھا کیونکہ یہ تینوں طبقات لاہور کی ترقی میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ ان تینوں طبقات کے اثر ونفوذ کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ لاہور میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے بعض بہترین ادارے پائے جاتے تھے۔ مسلمان غیر مسلم اداروں میں جاتے تھے اور اس کے الٹ بھی ہوتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرگنگا رام جیسی شخصیات کی وسیع تر فلاحی سرگرمیوں کے اثرات ابھی تک لاہوریوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکے۔ (37) لاہور کی ثقافت مختلف اجزاء کا مرکب تھی، جبکہ یہاں پر اگر ایک طرف اولیاء کرام مثلاً حضرت میاں میر جیسے صوفیا کے مزارات موجود ہیں تو دوسری طرف سکھوں کے مقدس مقامات مثلاً ننکانہ صاحب، ڈیرہ صاحب وغیرہ بھی موجود ہیں۔

جہاں تک تقسیم کے دور کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے بھی لاہور اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں پر بھی اچھے خاصے فسادات دیکھنے میں آئے اور مشرقی پنجاب سے بہت سے مہاجر لاہور آ گئے تھے۔ اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہ تقسیم کے نتیجے میں لاہور کی علمی یا وسیع المنظر ثقافت پر کیا اثرات مرتب ہوئے یہ کہا گیا ہے:

''آزادی کا وقت قریب آنے پر لاہور میں تین لاکھ ہندو اور سکھ رہ رہے تھے۔ 19 اگست تک یہ تعداد کم ہو کر 10,000 تک رہ گئی تھی''(38)

فیصل آباد جو اس وقت لائل پور کے نام سے مشہور تھا ایک اہم شہر کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں پر بھی مشرقی پنجاب خصوصاً لدھیانہ سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے آئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں بہت سی آبادی غیر مسلموں کی بھی تھی جو کہ کاشتکاروں پر مشتمل تھی۔(39)

## کتاب کی تصوّراتی بنیاد

یہ سارے انٹرویو کر لینے کے بعد ہمیں بنیادی مانند کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اگرچہ بہت سے لوگوں بشمول بٹالیہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ زبانی یا غیر تحریری تاریخ بذاتِ خود ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی ایک اپنی اہمیت ہے، تاہم تقسیم کے دوران فسادات سے بچ جانے والوں سے ملنے کے بعد ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ تمام تر نقائص یا خامیوں کے باوجود اس کی کیا اہمیت ہے اور یہ کہ بعض اوقات اس میں مبالغہ آرائی، کا عنصر بھی موجود ہو سکتا ہے۔

''اپنی تمام تر حدود و قیود کے باوجود، زبانی تذکرہ تاریخ کو ایک منفرد زاویے، ایک مختلف تناظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے کیونکہ اس طرح کے تذکرے اکثر و بیشتر ارضی وقت کے حساب سے ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں، یہ بعض اوقات وقت کی ایسی بے لچک حدود کو دھندلا کر رکھ دیتے ہیں جن کے اندر تاریخ اپنا مقام متعین کرتی ہے، کیونکہ لوگ اپنی یادداشتوں کو مختلف تاریخوں یا مختلف نظام الاوقات کے خانوں میں رکھتے ہیں۔''(40)

زبانی تاریخ اس لئے بھی اہم ہے کیونکہ ایک مخصوص واقعے کی تفصیلات / حقائق سے ہٹ کر یہ ایک ایسی کھڑکی ہوتی ہے جس میں جھانک کر پتہ چلتا ہے کہ لوگ واقعات کو کسی طرح اپنی یادداشت سے کھنگال کر باہر لے آتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسے مخصوص واقعات بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں جو دستاویزی شکل میں محفوظ نہیں ہوتے یا جن کی طرف پہلے توجہ نہیں کی گئی ہوتی۔ اس نکتے کی ایک سادہ سی وضاحت اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ اگرچہ ہمیں اس حقیقت کا علم تو ہے کہ کسی بھی مخالف فرقے سے کسی طرح انتقام لیا جاتا ہے مگر ہم میں سے کتنے لوگوں کو دراصل یہ معلوم ہوگا کہ کسی مخالف فرقے کے رُکن کو مارنے کے جُرم میں خود اپنے ہی فرقے کے لوگوں سے

بھی انتقام لیا گیا ہے۔ انڈیا کی طرف ایک شخص سے انٹرویو کے دوران یہ حقیقت سامنے آئی کہ ایک بزرگ پاکستانی سیاستدان اختر عباس بھروانہ نے کس طرح اپنے والد صاحب کی داستان سنائی جو کہ جھنگ کی ایک مصروف سیاسی شخصیت تھے۔ تقسیم کے دوران بھروانہ کے والد صاحب نے اپنے مسلمان نوکروں سے کہا کہ وہ اس کے غیر مسلم دوستوں کو بحفاظت مہاجر کیمپ تک پہنچا آئیں۔ مگر مسلمان حفاظتی دستے کے لوگوں نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھروانہ کے دوستوں کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعے کا علم ہونے پر بھروانہ نے خود اپنے نوکروں کو قتل کر دیا۔(14)

اگر ہم اس کتاب کی اہم نظریاتی ساختوں کے حوالے سے گفتگو کرتے تو پھر بٹالیہ کی طرف سے اپنائی گئی ''زبانی تاریخ کی حکمتِ عملی'' جو کہ اس کتاب کی بنیاد ہے سب سے اہم نظر آتی۔ اس نے مختلف خامیوں اور فوائد کا جو تجزیہ کیا ہے اُس سے ہمیں یہ مدد ملی ہے کہ زبانی تاریخ کی حکمتِ عملی سے بڑے موثر اور منظّم انداز میں استفادہ کریں۔ وسیع پیمانے پر غارتگری کی صورتحال کی ماہر ماریا نے ہرش (Marianne Hirsch) کا ''مابعد یادداشت'' کا تصور بہت اہم اور مفید ثابت ہوا کیونکہ انٹرویو کئے جانے والے بعض افراد کو تقسیم کے دوران پیش آنے والے واقعات کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کا اتفاق تو نہیں ہوا تھا مگر انہوں نے اس حوالے سے بہت سے واقعات سُن رکھے تھے۔ ہرش نے بالکل درست کہا ہے کہ:(42)

''مابعد یادداشت کا مطلب ہے ان لوگوں کے تجربات جو اپنی پیدائش سے قبل پیش آنے والے واقعات کے تذکروں کے ساتھ پلے بڑھے ہوں، جن کی اپنی بعد از وقت کہانیوں کے اوپر گذشتہ نسلوں کی صدمات سے پُر وہ کہانیاں غالب آجاتی ہیں جن کو نہ تو وہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی تخلیق کر سکتے ہیں۔ (یہ) حافظے کا وہ خانہ ہوتا ہے جو زیادہ وسیع طور پر ثقافتی اور عوامی یادداشتوں سے بھرا ہوتا ہے نہ کہ محض انفرادی اور شخصی حافظے، شناخت اور عکسی نقوش (Projection) سے۔''

انٹرویو کئے گئے بعض افراد نے اپنے والدین کے تجربات کا ذکر بھی کیا جو کہ اب خود اس دنیا میں نہیں رہے تھے، جبکہ ایک ایسی صورت بھی دیکھنے میں آئی جہاں تقسیم کے دور کی کوئی شخصیت زندہ تو تھی مگر وہ ماضی کے حوالے سے بات کرنے سے قاصر تھی۔ یہ سب مابعد یادداشت کی جامع مثالیں تھیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ہماری اس کتاب کے حوالے سے دونوں پنجابوں

(مشرقی اور مغربی) کے درمیان ثقافتی ہم آہنگی یا مطابقت کا فہم بھی ضروری تھا کیونکہ ہماری تحقیق کا مرکزی نکتہ پنجاب کی تقسیم تھا۔ لہٰذا ء اس میں توجہ کا مرکز پنجاب ہی ہے، یعنی ایک ایسا خطہ جس کی اقدار، روایات، زبان، اور روحانی شخصیات تک مثلاً بابا بلھے شاہ، بابا فرید، اور سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک جی جو کہ سرحد کے دونوں طرف احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، سب میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ قبل از تقسیم کے ماحول، تقسیم اور بعد از تقسیم کے مصائب کی سمجھ جو دونوں پنجابوں کے مابین مشترکہ اقدار کو زبان اور ثقافت کے حوالے سے باہم مربوط کرتی ہے، بہت ہی معاون ثابت ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سرحد کے دونوں اطراف تعصّبات کو فروغ دیتے ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ دونوں اطراف کی پنجابی زبان ایک ہی ہے۔ (43)

ہجرت کر جانے والوں یا کر کے آنے والوں کے دل میں پُرانی یادوں کی کسک دراصل پنجابیوں کے مابین پائے جانے والے اس رشتے کا نتیجہ ہے جو کہ اپنی آبائی جگہوں سے ہجرت کر جانے کے باوجود کمزور نہیں ہوا۔ انس اور اپنائیت کا یہ احساس صرف ان لوگوں تک محدود نہیں ہے جو پنجاب کے اُس طرف سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ خالد حسن غلط نہیں ہے جب وہ کہتا ہے کہ: (44)

''پنجابی زبان اور پنجاب کی گرمجوشی اور توانائی سے بھرپور ثقافت باہمی روابط کو استوار کرنے والی ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ میری انڈیا میں رہنے والے ایسے پنجابیوں سے بھی ملاقات ہوئی ہے جو آزادی کے کئی عشروں بعد پیدا ہوئے تھے مگر جن کے خاندان اس پنجاب سے آئے تھے جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ انہیں اس سرزمین کی کشش اپنی جانب کھینچتی ہے جہاں سے ان کے آباؤ اجداد کو نکل کر جانا پڑا تھا۔ جب انڈیا سے تعلق رکھنے والے پنجابی پاکستانی پنجاب آئے ہیں تو انہیں بے پناہ محبت ملتی ہے اور لوگ ان کا اس طرح استقبال کرتے ہیں جس طرح پُرانے دوستوں کا کیا جاتا ہے۔''

آخری بات یہ کہ دونوں اطراف سے یعنی مشرقی پنجاب سے سکھوں اور مغربی پنجاب سے مسلمانوں کی یہ خواہش کہ وہ ایک دوسرے کے ممالک میں واقع مقدس مقامات کی زیارت کریں باہمی تعلق کو اور مضبوط بناتی ہے۔ سکھوں کو ننکانہ صاحب کے دورے کی شدید خواہش ہوتی ہے جہاں سکھ مذہب کے بانی نے جنم لیا تھا اور اس کے علاوہ دوسرے مقدس مقامات مثلاً کرتا پور

صاحب بھی ان کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔

کرتار پور عمومی طور پر برصغیر اور خاص طور پر پنجاب کی کثیر جہتی ثقافت کی جامع مثال ہے، ''جیسے کہ اُس وقت دیکھنے میں آئی جب بابا گورونانک دیو جی کا کرتار پور میں وصال ہوگیا (1539 میں) اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ان کی لاش دفنانے کی غرض سے اپنا اپنا دعویٰ پیش کر دیا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کی لاش پر ہندو اور مسلمان دونوں ہی پھول رکھیں گے اور جس کے پھول اگلی صبح تک مُرجھا جائیں گے وہ اپنا حق کھو بیٹھے گا۔ جب صبح ہوئی اور لوگوں نے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ لاش غائب ہے اور دونوں فریقوں کی طرف سے رکھے گئے پھول ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ آخر کار دونوں طبقات نے کپڑا آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیا اور مسلمانوں نے اسے دفن کر دیا جب کہ ہندوؤں نے اسے اپنے دستور کے مطابق نذرِ آتش کر دیا۔ اس لئے اب وہاں پر قبر کے ساتھ ہی ایک سمادھی بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بابا گورونانک تمام مذاہب کے لوگوں کے لئے مساوی طور پر مقدس ہستی ہیں کیونکہ ان کے تین مقابر، یعنی اسلامی مزار، ہندوؤں کی سمادھی اور سکھوں کی انگیتھا کی صورت میں بیک وقت موجود ہیں۔ پوری دنیا میں ایک ہی شخصیت کے بیک وقت تین مزار کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مزار وہاں موجود تھا تو کوئی بھی اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا، اور ایک مسلمان سپاہی جو پاکستانی فوج چھوڑ گیا تھا اس کی دیکھ بھال اکیلا ہی کر رہا تھا۔ (45)

اسی طرح ہندوؤں کو کٹاس راج کے دورے کا اشتیاق رہتا ہے جبکہ مغربی پنجاب کے مسلمان مشرقی پنجاب اپنے پُرانے گھروں پر ایک نظر ڈالنے اور اپنے آباء کی قبروں پر جانے کے ساتھ ہی پنجاب میں صوفیاء کے مزارات اور راجستھان میں اجمیر شریف کی زیارت کے لئے بے چین رہتے ہیں۔

بعض پنجابی ذاتوں مثلاً سرحد کے دونوں اطراف جاٹ برادریوں کے درمیان ''نسلی بندھن'' کے بشریاتی نمونے کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جس طرح کہ پاکستان میں رہنے والے پختونوں کے درمیان پائی جانے والے نسلی بندھن کی بے شمار مماثلتیں۔ اگرچہ ان دونوں قبائل کے درمیان اہم تفریق یہ ہے کہ پختونوں کا مذہب ایک ہی ہے جبکہ جاٹ لوگوں کا تعلق بہت سے مذاہب سے ہے۔ (46) ایک ہی ذات کے لوگوں کے مابین مختلف مذہبی عقائد کا پایا جانا دونوں

پنجابوں، خاص طور پر جاٹوں کے اندر ایک عام سی بات ہے جیسا کہ ٹالبوٹ کہتا ہے۔(47)

پنجاب کے اندر ایک ہی خاندان/ذات کے لوگوں میں مسلمان، ہندو اور سکھ مذہب کے پیروکاروں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے جو کہ اپنی ساری تاریخ کے دوران ایک شورش زدہ سرحدی علاقے کے طور پر نمایاں رہا ہے۔

''برادری'' کا احساس جو کہ سرحد کے دونوں جانب وڑائچ اور دوسری جاٹ ذاتوں مثلاً باجوہ، چیمہ اور رندھاوا کے درمیان پایا جاتا ہے اور جو کسی خونی رشتے یا دور دراز تک پھیلی رشتے داریوں پر مبنی نہیں ہے، اور جو تقسیم کے بعد کے دور میں بھی ختم نہیں ہوا خاص طور پر دلچسپی کا حامل ہے۔(48)

جاٹ لوگوں کے ''قبائلی بندھن'' اور ''برادری'' کی صورت میں یکجا رہنے کی چند مثالیں جو سامنے آتی ہیں ان میں سے زیادہ واضح مثالیں گجرات کے چوہدریوں کے مابین تقسیم سے قبل کے روابط کی ہیں۔ چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی (وڑائچ) کے ابھی تک جاٹ سکھ خاندانوں خاص طور پر چیمہ اور بھنڈر خاندانوں سے روابط برقرار ہیں جو کہ اوّل الذکر کے والد چوہدری ظہور الٰہی سے قریبی مراسم رکھتے تھے۔ اسی طرح چوہدری محمد انور بھنڈر کا بھی مشرقی پنجاب کے بھنڈر خاندان سے ربط برقرار ہے کیونکہ دونوں کے آباؤ اجداد ایک ہی ہیں۔(49)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی پنجاب کے سابقہ وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی اور کیپٹن امریندر سنگھ (جو کہ ایک جاٹ سکھ ہے) جو کہ مشرقی پنجاب کا سابق وزیر اعلیٰ رہا ہے، دونوں نے سرحد کے دونوں طرف موجود پنجابوں کے درمیان تعلقات بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ دونوں کی قدرتی شخصیت/مزاج یعنی کہ جاٹ برادری سے باہمی تعلق کے عنصر کو اس حقیقت سے جوڑنا سادہ پن کی علامت نظر آتی ہے، تاہم پھر بھی بعض لوگوں کے خیال میں مُشترکہ، پس منظر کا عنصر معاون ثابت ہوا۔

گجرات کے چوہدری اپنے منفرد انداز میں انڈو پاک امن کوششوں میں آگے آگے ہیں اور اگرچہ چوہدری شجاعت حسین کے لئے، جو کہ پاکستان کا سابق وزیر اعظم رہنے کے علاوہ حکمران اتحاد میں شامل سب سے بڑی سیاسی جماعت کا سربراہ بھی ہے، سفارت کاری میں اپنا کردار ادا کرنا ایک فطری امر ہے، تاہم چوہدری پرویز الٰہی کے بھارتی وزرائے اعلیٰ، خاص طور پر

پنجاب کے امریندر سنگھ اور ہریانہ کے اوم پرکاش جوتالہ کے ساتھ باہمی روابط کو زیادہ توجہ حاصل رہی ہے کیونکہ یہ روابط وفاقی اکائیوں کی سطح پر رہے ہیں بہ نسبت وفاقی سطح کے۔(50)

درحقیقت، پاکستان کے گذشتہ انتخابات (2008) سے کچھ ہی روز قبل چھپنے والے ایک مضمون میں چوہدری پرویز الٰہی پر جاٹوں کی طرف جھکاؤ رکھنے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔(51)

''پرویز الٰہی مکمل طور پر برادری کی طرف جھکاؤ رکھنے والا آدمی ہے۔ جاٹ برادری کا معاملہ ہوتو پھر اور کوئی چیز بھی اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس عنصر کی بناء پر پنجاب کا صدیوں پرانا برادری نظام متاثر ہوسکتا ہے اور یوں یہ لطیفہ سچ ثابت ہوسکتا ہے کہ ہم اس ملک کو اسلامی جمہوریہ آف جاٹستان میں بدلنے کی راہ پر گامزن ہیں۔

ایک اور وڑائچ، چوہدری اعتزاز احسن کے بھی مشرقی پنجاب میں رہنے والے پنجابیوں سے قریبی روابط استوار رہے ہیں۔ وہ اپنی پنجابی شناخت پر عموماً اور جاٹ نسل سے ہونے پر خصوصاً مخر محسوس کرتا ہے۔ احسن سندھ کی ناز کی داستان میں سکندر کو پورس کی طرف سے پیش آنے والی مزاحمت کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔

ہم یہاں اس نکتے کو خاص طور پر سامنے لائیں گے کہ ان قبائلی یا گروہی رشتوں کی روایات صرف جاٹ برادری تک محدود نہیں ہیں نہ ہی یہ خالصتاً ذات پات پر مبنی ہیں۔ اس کے پس پردہ زیادہ تر اقتصادی اور سماجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ دونوں اطراف ثانوی جاٹ ذاتوں کی طرح کھتری ذاتیں بھی موجود ہیں مثلاً سیٹھی، سہگل، مگوں وغیرہ جو کہ دونوں طرف کے پنجابوں میں عام ہیں۔ مشرقی پنجاب کی طرح مغربی پنجاب کے کھتری، بھی تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ اسی طرح گجر اور راجپوت بھی ایک جیسی ذاتیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ رشتہ داری اور برادری کے بندھنوں نے دونوں طرف نہ صرف تقسیم سے قبل کے بلکہ تقسیم کے بعد کے زمانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ قبائلی یا برادری کا بندھن محض ذات پات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس کے پس پردہ بہت سے اور مشترکہ مفادات بھی کارفرما ہیں، مثلاً اقتصادی اور پیشہ ورانہ مفادات وغیرہ۔ اس طرح ایک ہی گاؤں/دیہات سے تعلق بھی اہمیت رکھتا ہے، خواہ ذات پات کا فرق ہی کیوں نہ ہو۔(52)

ایک اور ادبی کاوش جس نے ہمیں ایک اہم ''نظریاتی نمونہ'' فراہم کیا وہ تقسیم پر بنیادی اہمیت کی حامل تحقیق بہ عنوان شرمناک پرواز(Shameful Flight) تھی۔(53) بہت سے

لوگوں کا انٹرویو کرنے سے قبل یہ سمجھنا شاید مُشکل تھا کہ اس نکتے کی کیا اہمیت ہے جو والپورٹ پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ برطانوی حکومت نے تقسیم کا کام بہت جلدی میں سرانجام دیا اور اس طرح بہت سے لوگ بے خبری میں کوئی منصوبہ بندی کرنے کے قابل نہ رہ سکے۔

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ جن لوگوں کا انٹرویو کیا جا رہا تھا ان میں سے اکثریت نے یہی اظہار خیال کیا کہ اُنہوں نے صورتحال کو معمول کے واقع سے زیادہ اہمیت نہ دی اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ جلد ہی اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں گے اور بس یہ چند ماہ کی بات ہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سرحد کے دونوں طرف بہت سے لوگوں نے اپنی قیمتی اشیاء ہمسایوں اور دوستوں کے گھروں میں رکھوادی تھیں اور بہت کم ہی خوش نصیب تھے جو اپنی ان اشیاء یا امانتوں کو واپس لینے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔

رگھوویندر اتنوار اس صورتحال کی ایک بہت ہی خوبصورت مثال پیش کرتا ہے: (54)

''اسی طرح کی کہانیاں کہ کس طرح بعض امیر خاندانوں نے اپنی قیمتی اشیاء زمین میں دبادی تھیں کہ بعد میں آ کر واپس نکال لیں گے، تقسیم کے بعد کے مہینوں میں بہت عام تھیں۔ اس طرح کے بہت سے خزانے یا دفینے بعد میں ان خاندانوں کے ہاتھ لگ گئے جنہوں نے متروکہ املاک پر قبضہ جما لیا تھا۔''

ہر بھجن سنگھ کے خاندان کی طرح جو کہ منٹگمری چھوڑ کر چلے گئے تھے بہت سوں نے تو اپنے گھروں کی چابیاں تک بھی کسی کے حوالے نہ کیں: وہ چابیاں اپنے ساتھ ہی لے کر چل پڑے یہ سمجھ کر کہ وہ جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ (55)

اگرچہ اس طرح کے بہت سے شواہد ملے ہیں کہ لوگوں نے واپس جا کر اپنی اِملاک بازیاب کرانے کی کوشش کی مگر اپنی ان کوششوں میں ناکام رہے، یہاں اس امر کا ذکر بہت دلچسپ رہے گا کہ، جیسا کہ پرتاب سنگھ بجاج (مرحوم) کے ساتھ ہوا جو کہ فاروق آباد/ تحصیل سے تعلق رکھنے والی ایک مشہور کاروباری اور مخیّر شخصیت تھی، جس نے کہ خالصہ اسکول کے قیام میں بھی مدد دی تھی جو ابھی تک فعال ہے، کیونکہ اسے خوش قسمتی سے اپنی کھوئی ہوئی املاک کے حصول میں دوسروں کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ بجاج نے اگست کے تیسرے ہفتے کے قریب قریب اپنے خاندان سمیت پاکستان سے روانگی کے وقت خطرہ مول لیتے ہوئے اپنی بہت سی قیمتی

اشیاء اپنے گھر واقع فاروق آباد چھوڑ دیں۔ اپنے خاندان کو انڈیا چھوڑ کر وہ کسی نہ کسی طرح واپس پاکستان آیا اور اپنے گھر جا کر کچھ ایسی چیزیں واپس لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو اس نے یہاں سے جاتے ہوئے چھپا دی تھیں۔ (56)

بجاج کی طرح، بہاولپور کی تحصیل خانپور سے تعلق رکھنے والا روشن لال بھی خوش قسمت نکلا کہ اسے بھی واپس اپنے گھر آ کر کچھ ایسی چیزیں حاصل کرنے میں کامیابی ہو گئی تھی جو وہ یہاں چھپا کر چلا گیا تھا۔ یہ سب کچھ نئی وجود میں آنے والی پاکستانی ریاست کے چند ایک ایسے سرکاری عہدیداروں اور سیاست دانوں کے تعاون سے ممکن ہو پایا جو اس کے زمانۂ طالب علمی کے ساتھی تھے۔ (57)

مغربی پنجاب خصوصاً لاہور سے تعلق رکھنے والے بہت سے غیر مسلم خاندان اس وقت گرمیوں کی چھٹیوں پر تھے اور حالات کی تبدیلی سے پریشان ہونے کے باوجود انہیں ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ واپس اپنے آبائی گھروں کو نہیں لوٹ سکیں گے۔ (58) فرقہ ورانہ فسادات پھوٹ پڑنے سے قبل بہت سے غیر مسلموں نے پاکستان کے انتخاب کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ انڈیا کے سابق وزیر اعظم آئی۔ کے گجرال کے والد اوتار نرائن گجرال نے بھی پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور محمد علی جناح کی کابینہ میں شرکت کے لئے مکمل تیاری بھی کر لی تھی جیسا کہ اس کے بیٹے ستیش گجرال کے بقول: (54)

''ان (لالہ اوتار نارائن گجرال) کی معلومات کے مطابق قائداعظم محمد علی جناح انہیں اپنے وزراء کی کابینہ میں شرکت کی دعوت دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ وہ پاکستان سے وفاداری کا حلف اُٹھانے کی نیت سے پاکستان پہنچ گئے، اور شاید وہ پہلے اور واحد غیر مسلم ہوتے جو کہ انتظامی کونسل میں شامل ہوتے۔ مگر جس وقت اُنہوں نے پاکستانی پارلیمنٹ کے رُکن کی حیثیت سے حلف اُٹھایا اس وقت تک دونوں قومیں جنگ کے لئے پر تول چکی تھیں۔ اور پاکستانی اور بھارتی دونوں طرف کے پنجاب میں فرقہ ورانہ فسادات بھی پھیل گئے تھے۔''

اسی طرح مشہور پاکستانی لکھاری اور صحافی خالد حسن کا خاندان جموں میں رہائش پذیر تھا مگر گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ سری نگر چلے جاتے تھے۔ بقول حسن اُنہیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے گھر واقع جموں نہیں لوٹ پائیں گے۔ (60)

''میرے والد صاحب ریاست جموں وکشمیر میں ڈائریکٹر میڈیکل سروسز تھے۔ حکومت سردیوں میں سری نگر سے جموں چلی جاتی اور گرمیوں میں واپس سری نگر۔ ہم جموں واپس آنے کے لئے تیار تھے مگر نہ صرف یہ کہ ریاست کے بہت سے حصے شورش کی لپیٹ میں آ چکے تھے بلکہ ہر طرف افراتفری، غیر یقینی صورتحال اور افواہیں عروج پر تھیں، اور بانہال پاس (جو وادی کو صوبۂ جموں سے الگ کرتا ہے) کا راستہ بھی بعض وجوہات کی بناء پر بند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ والد صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم راولپنڈی کی طرف جانے والی جہلم ویلی روڈ کا راستہ اختیار کریں گے، جہاں سے ہم سیالکوٹ کے راستے جموں پہنچیں گے، جو کہ جموں سے 30 میل سے بھی کم فاصلے پر تھا، ہم سیالکوٹ پہنچے تو وہاں ہمیں راولپنڈی اور گجرات میں ہونے والی ہلاکتوں کے شواہد ملے۔ جب ہم اکتوبر میں سیالکوٹ پہنچے تو جموں میں مسلمانوں کا قتل عام اپنے عروج پر تھا۔ وہاں سے مسلمانوں کو نکالنے اور پاکستان جانے والوں کو راہ میں گھات لگا کر لوٹنے کھسوٹنے کا سلسلہ جاری تھا (حالانکہ انہیں اس راستے پر ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی) اور ان کاروائیوں میں مسلح شہری اور مہاراجہ کی فوج اور پولیس کے لوگ سب شامل تھے۔ چنانچہ ہم سیالکوٹ میں ہی پھنس کر رہ گئے جو ہمارے لئے گھر کی طرح ہو گیا۔''

اس تحقیق کے حوالے سے ایک اور تناظر جو اہمیت رکھتا تھا وہ عزت و آبرو کا تصور تھا جو کہ تینوں فرقوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہ نکتہ عیاں کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ نہ صرف روایتی قبائل بلکہ جنوبی ایشیا میں بسنے والی تمام اقوام/طبقات کے لئے خواہ وہ کسی علاقے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، زمین، عورت اور عزت بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ (61) البتہ جہاں تک کاشتکار کے اس دُکھ کا تعلق ہے جو اسے اپنی زمین چھوڑتے وقت ہوتا ہے تو اس کو رگھوویندر اتنوار سے زیادہ بہتر انداز میں اور کوئی بیان نہیں کر سکتا، خاص طور پر ایک کسان کی شخصیت کے حوالے سے: (62)

''ایک عام پنجابی، خاص طور پر سکھ کسان کے لئے، تقسیم ہند کسی تباہی سے کم نہ تھی۔ اپنا کاروبار یا دکان چھوڑ کر چلے جانا اور بات ہے، مگر زرعی زمین کو چھوڑنے کا مطلب صرف زمین کا ایک ٹکڑا چھوڑ جانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ بہت سی جذباتی وابستگیاں بھی چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اگر ایک سکھ کاشتکار دوسروں کی نسبت زیادہ شدید ردِّعمل کا مظاہرہ کر رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سخت محنت کر کے زمین کے وسیع تر قطعات کو زرخیزی عطا کی تھی اور جب اس کی اگلی نسلوں کے لئے لُطف اندوز

ہونے یعنی اپنے باپ دادا کی محنت کا پھل کھانے کا وقت آیا تو اسے اپنی زمین سے بے دخل ہونا پڑا۔''

جہاں تک خواتین کی عزت و آبرو کا تعلق ہے تو اس امر کا اور کوئی جواز نہیں ملتا کہ بہت سی عورتوں نے تقسیم کے دوران خودکشی کر لی یا پھر خود اپنے ہی خاندان کے ہاتھوں ہلاک کر دی گئیں، اگرچہ ابھی تک اس طرح کی ہلاکتوں کی صحیح تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکا۔ عورتوں کو زہر تھما دیا گیا یہ کہہ کر کہ کسی غیر مرد کا ہاتھ چھو جانے سے بہتر ہے کہ تم موت کو گلے لگا لو۔ یہ ساری صورتحال عورتوں کی غیرت کے نام پر ہلاکتوں اور خودکشیوں کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی تا کہ اُنہیں نہ صرف یہ کہ کسی غیر مذہب کے مرد کا بلکہ دوسروں کی زندگیاں بچانے والا ہاتھ بھی نہ چھو پائے۔ (63)

اکثر صورتوں میں تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین کو یہ ہدایت دی گئی تھیں کہ کسی بھی ناخوشگوار صورتحال کے خطرے کی صورت میں جبکہ کسی دوسرے فرقے کا مرد تمہیں بے آبرو کرنے کی کوشش کرے تو خود کو گولی مار کر یا تو ہلاک کر لینا یا سیکھ لو کہ خود کو کس طرح گولی مارنی ہے۔ اس پہلو کو جتنی خوبصورتی سے ''تھوہا خالصہ'' کے واقعے کے ذریعے، جس میں کہ ایک سکھ عورت بے عزتی سے بچنے کے لئے کنویں میں چھلانگ لگا دیتی ہے، عیاں کیا گیا ہے شاید ہی کسی اور طریقے سے کیا جا سکتا ہو: (64)

حالات میں مزید بگاڑ اس وقت پیدا ہوا جب عصمت دری کا نشانہ بننے والی بہت سی مسلمان خواتین کو اور اسی طرح دوسرے فرقوں کی خواتین کو ان کے خاندان والوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا خاص طور پر اس صورت میں جبکہ وہ حاملہ یا بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ وہ خواتین جو کہ حاملہ ہو چکی تھیں اُنہیں کہا گیا کہ یا تو وہ اسقاطِ حمل کروالیں یا پھر کہیں اور ٹھکانہ بنالیں اس صورتحال کی بہترین عکاسی ہندی فلم ''پنجر'' میں کی گئی ہے جس میں کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں اغواء ہو جانے والی ہندو عورت کو اس کے گھر والے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ (65)

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خواتین کو تین طرح سے جبر کا نشانہ بنایا گیا: سب سے پہلے اغواء کے ذریعے: پھر تقسیم کے بعد بہت سی مثالوں میں ان کی بازیابی اور زبردستی واپس لے جانے کی صورت میں: اور تیسرے اگر اغواء کے بعد مگر بازیابی سے پہلے ان کے کوئی بچے ہو چکے تھے۔ تو ان کے مسترد کر دیئے جانے یا ان سے محروم ہو جانے کی صورت میں۔ (66)

غیرت کے نام پر انتقام یا ''بدلے'' کا ایک اور منفی پہلو اس حقیقت کی صورت میں عیاں

ہوا کہ پاکستان کی جانب ہونے والے فسادات میں اس وقت مزید شدّت اور تیزی آجاتی جب مسلمانوں کی لاشوں سے بھری ہوئی ٹرین اپنی منزل پر پہنچ جاتی۔ مہاجرین کی حالتِ زار اور آہ وزاریاں ایسے لوگوں کو بھی مُشتعل کر کے رکھ دیتیں جو تصورات دیگر کافی عرصے سے پُرسکون ماحول میں رہ رہے تھے۔ اس نکتے کو ٹالبوٹ اور بٹالیہ نے ان الفاظ میں اُجاگر کیا ہے: (67)

''پنجاب کے بہت سے علاقوں میں مہاجرین کی آمد یا پھر لاشوں سے بھری ہوئی ان ٹرینوں کو دیکھ کر جو بڑی احتیاط سے بنائے گئے منصوبوں کے تحت حملوں کی زد میں آتی تھیں، انتقامی کاروائیوں اور ہلاکتوں کا سلسلہ درسلسلہ شروع ہو جاتا۔''

ہم نے جن لوگوں کا انٹرویو کیا ان کی اکثریت کا بھی یہی خیال تھا کہ جب تک باہر سے ہلاک شدگان کی لاشیں نہ پہنچ جائیں اس وقت تک حالات پُرسکون رہتے۔ اس نکتے کی وضاحت بھی فیصل آباد سے لدھیانہ جانے والے مہاجرین کی ایک مثال کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے، جس میں کہ اظہار رائے کرنے والوں کی اکثریت نے یہی کہا کہ امن اُس وقت تک برقرار رہتا جب تک کہ کوئی مہاجرین کا قافلہ نہ پہنچ جاتا۔ حتیٰ کہ انٹرویو دینے والوں کی بھی یہی رائے تھی۔ اس طرح کی صورتحال میں لوگوں کے لئے کسی کی جان بچانا انتہائی مشکل کام تھا، اگرچہ اس تحقیق کے دوران انٹرویو دینے والوں کی اکثریت نے بے بس لوگوں کو بچانے کے سلسلے میں جرأت وہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔

''عزت/غیرت'' کے منفی تصور کے برعکس بہت سے لوگوں نے دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی جان بچا کر انسانیت کی آبرو رکھ لینے کا مظاہرہ کیا، خواہ وہ یہ ایسا اپنے فرائض کی ادائیگی کے طور پر کر رہے تھے یا پھر ذاتی اہلیت یا صلاحیت کے بل بوتے پر۔ جس طرح، مثال کے طور پر کچھ لوگوں نے دوسرے یا مخالف فریق کی خواتین کو اغواء یا اُس کی عصمت دری کر کے ان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا، بالکل اسی طرح بعض لوگوں نے بے گناہ افراد اور بچوں کی زندگیاں بچانے کو اپنی آبرو سمجھا۔ (68) یہ نکتہ بہت سے مکالموں کے دوران واضح طور پر سامنے آیا۔ اگرچہ ''مُثبت آبرو'' کے حوالے سے بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں، تاہم ان مسلمان طلباء کی کہانی اپنی مثال آپ ہے جنہوں نے ضلع شیخوپورہ میں جہاں کہ فسادات نے بہت شدید تباہی مچائی ہوئی تھی، کے اپنے سکھ اُستاد اور اس کی بیٹی کی جان بچالی تھی۔

''ضلع شیخوپورہ میں نارنگ نامی قصبے میں ایک سکھ ہیڈ ماسٹر ہوتا تھا جس نے مقامی ہائی

اسکول کے اندر کئی نسلوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ اس کی ''جوان بیٹیاں تھیں جبکہ اس کی بیوی کچھ عرصہ پہلے کہیں گم ہو چکی تھی۔ بلوائی اس کے خون کے پیاسے ہو کر اس کے مکان کے گرد اکٹھے ہو گئے، بعض بے باک قسم کے نوجوان اس کی معصوم بیٹیوں کو اغواء کرنے کے درپے تھے۔ یہ صرف اور صرف خدائی مداخلت ہی تھی کہ اس کے کچھ پُرانے طلباء کو واقعے کی خبر ہو گئی اور اُنہوں نے اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر خاندان کو بچالیا۔

بعدازاں اُنہوں نے بوڑھے سکھ اور اس کی جوان بیٹیوں کو خود اپنی نگرانی میں سرحد تک پہنچا کر الوداع کیا۔ (69)

اس کے علاوہ ایک اور مثال بھی ہے جو کہ دلوں میں انسانیت کا ایک عظیم جذبہ اُجاگر کر دیتی ہے۔ معروف پنجابی لکھاری پرابھجوٹ کور کا باپ مرحوم ندھان سنگھ سچار فوج میں فارم آفیسر تھا۔

اگرچہ اس کا تعلق پاکستان میں لنگڑیال، ضلع گجرات سے تھا، تاہم تقسیم سے چند برس قبل اس کی تعیناتی ممبئی میں ہو گئی جبکہ اس کے بچے لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس کے گاؤں میں مسلمانوں کی زمینیں کھتری سکھوں کے پاس تھیں۔ مسٹر سچار نے مسلمانوں کو ان کی زمینیں واپس دلانے میں مدد کی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ان کے دل میں اس قدر احساس تشکر تھا کہ اس گاؤں میں ایک بھی غیر مسلم نہیں مارا گیا۔ اس کے برعکس ان سب کو گاؤں سے فرار ہو جانے میں مدد دی گئی اور وہ آخر کار جموں پہنچ گئے۔ (70)

''وطن'' یا ''پیدائشی'' یعنی جائے پیدائش، اور پشتینی جیسی اصطلاحیں بھی اس نسل کی حالت زار کا تجزیہ کرنے میں مساوی اہمیت کی حامل ہیں جسے تقسیم کے صدمے سے گزرنا پڑا۔ آخر اپنے گھر کو چھوڑ کر چلے جانا ہمیشہ ہی دردناک قسم کا تجربہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی آبائی جائے پیدائش کو دیکھ آنے کی تمنا بھی ہمیشہ دل میں موجود رہتی ہے۔

غالباً ''وطن'' کی اہمیت کا اندازہ اس سے بڑھ کر اور کسی حقیقت سے نہیں لگایا جاسکتا کہ پاکستان میں بہت سے بھارتی باشندوں سے اگر اب بھی یہ پوچھا جائے کہ ان کا تعلق کہاں سے ہے تو وہ گوجرانوالہ، راولپنڈی وغیرہ وغیرہ کا نام لیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے پاکستانیوں سے یہ سوال کیا جائے تو وہ جواب میں دہلی، امرتسر، لدھیانہ وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس امر کی کیا وضاحت کی جاسکتی ہے کہ انڈیا میں بہت سی دوکانوں اور سٹورز وغیرہ کا نام

''گوجرانوالہ''، ''راولپنڈی''، اور ''لاہور'' کے نام پر ہے اور اسی طرح پاکستان میں بھی دکانوں کے نام ''امرتسر''، ''لدھیانہ'' اور ''انبالہ'' کی یاد میں رکھے گئے ہیں؟ اس کا جواب شاید یہی ہوسکتا ہے کہ یہ پرانی یادوں کی شدید کسک اور اس کے ساتھ ہی ماضی کے ساتھ چمٹے رہنے کی خواہش کا اظہار ہے۔

اپنے آبائی قصبے/شہر کے ساتھ اس طرح کے لگاؤ یا وابستگی کی ایک ایسی ہی جامع یا بہترین مثال اور تار سنگھ کی ہے جو ضلع سرگودھا کے ایک علاقے رنگ پوری سے لدھیانہ ہجرت کر گیا تھا۔ اس نے 1980ء میں اپنا ایک کاروبار شروع کیا اور دکان کا نام رنگپوری رکھا۔ اور یہ نکتہ بھی بہت دلچسپی کا حامل ہے کہ انڈیا میں چھپنے والے اخباروں کے اندر تعزیتی کالموں میں ابھی تک اس امر کا ذکر کیا جاتا ہے کہ مرحوم کا تعلق لاہور یا کسی اور پاکستانی علاقے سے تھا۔

یہ صرف ان لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے جو وہاں پیدا ہوئے تھے بلکہ وہ بھی جن کے بزرگ سرحد کے اس پار سے آئے تھے، ان علاقوں سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں، جنہیں پشتینی یا جائے پیدائش یا ایسی جگہ کہتے ہیں جہاں ایک ہی خاندان کی کئی نسلیں اکٹھی رہتی آئی ہیں۔ وابستگی کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے مگر اس کے باوجود تعلق کا احساس برقرار رہتا ہے۔ آئیان ٹالبوٹ اس نکتے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ (71)

> ''اپنے آبائی گھروں کے لئے سابقہ مہاجرین کی اجتماعی اور ذاتی یادوں کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ ماضی کے ساتھ ربط رکھنے کی ضرورت کا احساس بہت طاقتور ہوتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں اپنے آبائی گھروں کا دورہ کرنے کے موقع پر بہت سے رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ یہ صرف جذباتی لگاؤ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ برصغیر کی ثقافت کے تناظر میں شناخت کے حوالے سے آبائی گھر کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اپنی آبائی سرزمین سے، قبروں سے (مسلمانوں کا) مقدس دریاؤں اور پانی کے ذخیروں سے لگاؤ اپنے دیس کے ساتھ وابستگی کی اہم خصوصیات ہیں۔ اس طرح کا لگاؤ صرف اس نسل تک محدود نہیں ہے جو ہجرت کر کے وہاں سے آئی یا گئی تھی، اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اس فرقے یا سماجی طبقے کے لئے ایک مضبوط احساس کی ضرورت

اختیار کرسکتا ہے۔ پنجابی ہندوؤں کی بزرگ نسلوں کے لئے جو کہ اب دہلی
میں سکونت اختیار کر چکے ہیں، لاہور کی یادوں کی کسک بہت شدید ہے
جس کا وہ مل بیٹھ آ کر آپس میں اظہار کرتے رہتے ہیں۔''

کسی بھی سرزمین سے اس لئے لگاؤ محسوس ہونا کہ وہاں پر کسی کے آباؤ اجداد دفن ہیں، صرف اس صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب کسی کو خود اس کا ذاتی تجربہ ہو۔ ناہید رضوی کے بقول جو کہ اب لاہور میں رہتی ہے، اُسے انڈیا میں سب سے پہلے جس جگہ کے دورے کی تمنا تھی وہ پٹیالہ تھا کیونکہ وہاں اس کے آباؤ اجداد دفن تھے۔ انڈیا میں مارچ 2005ء میں ہونے والی پاک۔انڈیا کرکٹ سیریز کے دوران نیویارک ٹائمز نے پاکستانی اور بھارتی باشندوں کے اندر آبائی گھروں یا مقامات کے حوالے سے لگاؤ کے احساسات کا عنصر نمایاں کرنے کے لئے ایک پاکستانی تماشائی کے الفاظ کا حوالہ دیا (72):

''امرتسر وہ واحد جگہ ہے جس کا دورہ کرنے کے لئے عظیم کے دادا، دادی/نانا نانی نے خاص طور پر ہدایت کی۔ وہ 1947ء میں امرتسر سے بھاگ کر لاہور آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اُنہوں نے کہا: ''تمہیں امرتسر کے پانی کے کچھ گھونٹ ضرور پینے چاہئیں۔''

اگر آباؤ اجداد کسی خاص جگہ دفن نہ بھی ہوں تو پھر بھی کسی جائے پیدائش اور تعلیم حاصل کرنے والی جگہ سے اُنسیت برقرار رہتی ہے۔ مثلاً تقسیم کے تقریباً ساٹھ برس بعد بھی اس طرح کے مناظر عام ہیں کہ پاکستان کے کسی خاص علاقے سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کی محفل میں ان علاقوں کے حوالے سے ماضی کی یادوں کو تازہ کیا جا رہا ہے جو اُنہیں حالات کے جبر کے تحت چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔

ٹالبوٹ نے پنجابی ہندوؤں اور لاہور کیلئے ان کی محبت کا جو تجزیہ کیا ہے اُس کی بہترین عکاسی اس حقیقت کے ذریعے کی گئی ہے کہ بہت سی سماجی/انجمنوں مثلاً انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں یہ ایک عام منظر ہوتا ہے کہ بہت سے بوڑھے لوگ مل بیٹھ کر لاہور میں اپنے کالج کے زمانے اور اس کے ساتھ ہی پاکستان میں زندگی کے گزارے ہوئے ایام کو یاد کر رہے ہیں۔ دراصل ''لاہوریوں'' کا یہ گروہ اسی کوشش میں مصروف رہتا ہے کہ کم از کم ہفتے میں چند ایک مواقع ایسے ضرور نکالے جائیں جب وہ اِکٹھے ہو کر ماضی کے تجربات ایک دوسرے کو بیان کر سکیں۔ (73)

حتیٰ کہ آبائی وطن اور پشتینی گھر کا تذکرہ سیاست دانوں کو بھی جذباتی کر دیتا ہے۔ اس

حوالے سے پاکستان کے سابق وزیراعظم نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کی مثالیں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ پرویز مُشرف نے انڈیا کے اپنے دونوں دروں کے دوران وقت نکال کر دہلی کے دریا گنج علاقے میں واقع اپنی نہر والی حویلی پر بھی نظر ڈالی۔

نواز شریف نے اپنے گھر کا نام اپنے آبائی گاؤں جاتی عمرہ کے نام پر رکھا جبکہ وہ رائے ونڈ میں واقع ہے۔ انڈیا میں واقع مشرقی پنجاب کے اپنے آبائی گاؤں کے ساتھ اس کے لگاؤ کو گاؤں کے باسیوں نے بھی تسلیم کیا ہے جنہوں نے اس کے لئے اُس وقت دعا بھی کی تھی، جب 1999ء میں اسے وزارت عظمٰی سے علیحدہ کر دیا گیا اور پھر دوسری مرتبہ اس وقت دعا کی جب نومبر 2007ء میں وہ جلاوطنی کاٹ کر وطن واپس آ گیا۔

جس طرح جاتی عمرہ کے مکین نواز شریف سے لگاؤ رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ کے آبائی گاؤں گاہ کے باسی بھی ان کے لئے ویسے ہی جذبات رکھتے ہیں۔

اگرچہ مؤخرالذکر نے کبھی اپنے گاؤں کا دورہ نہیں کیا تاہم گاہ کے لوگوں نے انڈیا کا وزیر اعظم بننے پر من موہن سنگھ کے حوالے سے بہت فخر کا اظہار کیا تھا۔(74)

''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ اس گاؤں کا ایک سپوت انڈیا کا وزیراعظم بننے والا ہے''

راجہ گل شیر نامی ایک کاشتکار نے فرطِ جذبات سے یہ الفاظ اپنے مُنہ سے نکالے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سنگھ کا گاؤں جو کہ ایک اور سابق بھارتی وزیراعظم آئی کے گجرال کے گاؤں کے نزدیک ہے، اب وزیراعظم کا گاؤں کہلاتا ہے۔(75)

آئی کے گجرال کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ: ''پاکستان سے آنے والا مہاجر ملک کے اعلیٰ ترین سیاسی منصب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھنے کی بناء پر جس نے برصغیر میں تاریخ کے دو واضح ترین ادوار کا مشاہدہ کیا، گجرال کے بارے میں یہ تصوّر کیا جاتا تھا کہ اس کی پاکستان کے حوالے سے پالیسی کی بنیاد پُرانی یادوں کی کسک اور غلط قسم کی اُمید پر رکھی گئی تھی۔''(76)

اسی طرح مُشترکہ ''وطن'' اور ''پشتینی'' گھر کے ذکر پر جذباتی ہو جانے کی ایک اور دلچسپ مثال بھارتی (مشرقی) پنجاب کے سابقہ وزیراعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ کی ہے، جس کا سلسلہ نسب پٹیالہ کے شاہی گھرانے سے بھی جا ملتا ہے۔ جب اس نے پاکستان کا دورہ کیا تو سابقہ پٹیالویوں

نے کیپٹن سنگھ سے ہر حال میں ملاقات کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ (77) ''پٹیالویوں کے اندر خلوص اور محبت کی وہی چاشنی ابھی بھی پائی جاتی ہے جو تقسیم سے قبل کی تھی۔''

ایک اور مُثبت پہلو اس صورتحال کا یہ ہے کہ مقتدر حلقے بھی وطن یا جائے پیدائش کی اہمیت کو اس وقت تسلیم کرتے نظر آتے ہیں جب معاملہ سیاستدانوں کا ہو۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ پاکستانی پنجاب کی حکومت نے گاہ کو ایک مثالی گاؤں قرار دیتے ہوئے وہاں ایک اسکول کا نام ''من موہن سنگھ گورنمنٹ پرائمری اسکول'' رکھ دیا۔ چنانچہ سادہ الفاظ میں بڑی مناسب بات کہی گئی ہے کہ (78):

''ہر پرندہ واپس اپنے گھونسلے کی طرف لوٹ جانا پسند کرتا ہے اور یہی کچھ ہم انسان بھی کرتے ہیں ہم اپنی جڑوں کے ساتھ بڑی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور انہی جڑوں کی کشش ہمیں اپنے اجداد کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔''

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے محرکات کے تحقیق کے دوران، قبل از تقسیم، درخائم (Durkheim) کی ''میکانکی'' اور ''سالمیانی یا نامیاتی'' یک جہتی کا نمونہ کافی مدد گار ثابت ہوا۔

جاٹوں کی کاشتکار برادریوں کے درمیان، جو مسلمان بھی تھے اور سکھ بھی، تعلق / ربط اس طرح سے نامیاتی نوعیت کا تھا کہ یہ بہت گہرا تھا اور اس کے پس پردہ اقتصادی جواز بھی کارفرما تھا۔

اس تعلق میں اس وقت اور بھی جان پیدا ہو گئی جب یونینسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا جو کہ ایک مخلوط ثقافت میں یقین رکھتی تھی۔ اسی طرح مسلمان کاشتکاروں اور غیر کاشتکار سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلق باہمی طور پر فائدہ مند و موافقت کا حامل (Symbiotic) تھا۔ غیر کاشتکار مالیات کی فراہمی کا کام کرتے تھے جبکہ مسلمان زیادہ تر کاشتکار تھے۔ بعض مخصوص دیہاتوں میں کاشتکار مسلمانوں نے، جن میں سے چند ایک سکھوں پر مالی انحصار کرتے تھے، موخرؔ الذکر کو ترغیب دی کہ وہ مغربی پنجاب میں ہی ٹھہرے رہیں۔

اس مثال میں یہ نکتہ خاص طور پر اہم ہے کہ مذہب (سکھ دھرم)، ذات پات (جٹ) پیشہ اور سماجی روایات جیسے عوامل مقامی افراد اور واپس لوٹ آنے والوں کے درمیان فوری طور پر

شناخت کا کوئی احساس پیدا نہیں کرتے۔ جس چیز نے اُنہیں مقامی باشندوں سے ممتاز کیا وہ ان تمام وسائل اور مواقع پر ازسرنو دعویٰ کرنے کی فوری جدّ وجہد کا عنصر تھا جو اُنہوں نے دوبارہ نئے سِرے سے شروع کرنی تھی۔

حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقسیم پر تخلیق کیا جانے والا ادب، شاعری، اور فلموں نے اس المناک واقع کے حوالے سے لوگوں کی جذباتی تکلیفوں یا زخموں پر مرہم رکھنے کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا ہے اور فائدہ مند ثابت ہوئے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے ہم خود کو حقیقی زندگی میں پیش آنے والے متذکرہ بالا واقعات کے ساتھ جوڑ سکتے تھے۔ اگرچہ امرتا پریتم کی طرح کے پنجابی شاعروں اور خوشونت سنگھ جیسے لکھاریوں کی طرف سے جس طرح یادوں کی کسک/صدمات کی منظر کشی کی گئی ہے، وہ ہوسکتا ہے کہ علمی نظریے سے مطابقت نہ رکھتی ہو مگر اس میں اس دور کی انسانی نفسیات اور بے پناہ صدمے کے حوالے سے کی گئی منظر کشی بہت مفید ہے اور ان کا حوالہ دیئے بغیر کوئی بھی تخلیق مکمل نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ خوشونت سنگھ کی ٹرین ٹو پاکستان ایک افسانوی تخلیق ہے تاہم منو ماجرا نامی ایک چھوٹے سے دیہات میں رہنے والے سکھ اور مسلمان کاشتکاروں کے درمیان موجودہ غیر مذہبی قبائلی تعلقات/بندھنوں کی سمجھ کے حوالے سے اس کا مطالعہ بے حد اہمیت رکھتا ہے یہ دراصل عین اسی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے جس کا اندازہ یا جھلک ہمیں دیہاتی ماحول میں رہنے والے افراد کے ساتھ سوال وجواب پر مبنی مکالمے کے بعد نظر آئی۔ اس سے بھی زیادہ خاص نکتہ یہ ہے کہ یہ ان دیہاتیوں کے رویوں میں آنے والی تبدیلیوں کے حوالے سے بہت واضح منظر کشی کرتا ہے جو صدیوں سے پُرامن طور پر اکٹھے رہتے چلے آرہے تھے۔

امریتا پریتم کی وہ نظم جس میں وہ وارث شاہ سے التجائیں کرتی نظر آتی ہے، شاید صنفی حوالے سے محسوس کئے جانے والے دُکھ کا انتہائی موثر اظہار ہے۔ اس نظم کو واہگہ کی سرحد کے دونوں طرف بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

متذکرہ بالا مکالموں اور مثالوں کے ذریعے ہم نے بعض درج ذیل سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے:

☆ کیا مختلف فرقوں/طبقوں کے درمیان ایسی سماجی رکاوٹیں یا تفریقیں حائل تھیں جنہیں عبور کرنے کی ضرورت تھی؟

☆ کیا تقسیم کے دوران زندہ بچ جانے والے تمام افراد کے لئے مخاصمت اور ایک دوسرے کے لئے منفی جذبات کا پیدا ہونا فطری امر ہے؟

☆ کیا ان میں سے کسی نے کبھی یہ سوچا تھا کہ تقسیم مستقل ثابت ہوگی؟

☆ کیا جن لوگوں نے مصائب برداشت کئے ہیں وہ دوسری جانب کے لوگوں کو زیادہ ناپسند کرتے ہیں؟ آیا کہ بچ جانے والے افراد ابھی تک دوسری جانب کے لوگوں کے ساتھ مخصوص تصوّرات اور علامات منسوب کرتے ہیں؟ کیا اُنہوں نے پُرانے دوستوں کے ساتھ روابط اُستوار رکھے ہوئے ہیں؟

☆ آیا آزادی کے فوراً بعد باہمی روابط میں اضافہ دیکھا گیا؟

سفارشات والے حصے میں ان اقدامات کی نشاندہی کی جائے گی جو مستقبل میں مُثبت تعلقات کو یقینی بنانے کے حوالے سے کئے جائیں گے۔

کتاب کے پہلے باب میں انڈیا کی طرف سے ان مُثبت کہانیوں کو پیش کیا گیا ہے جن میں ہندوؤں اور سکھوں نے یا تو مسلمانوں کو فرار ہونے میں مدد دی یا پھر مسلمانوں نے ان کو پاکستان سے فرار ہونے میں مدد دی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ انٹرویو کئے گئے افراد اب دہلی، امرتسر، کرک شیترا، لدھیانہ اور چندی گڑھ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ ان افراد نے ایسے علاقوں سے ہجرت کی تھی جہاں کہ صورتحال انتہائی مخدوش تھی مثلاً راولپنڈی وغیرہ یا پھر گوجرانوالہ کی طرح کے علاقوں سے جہاں کہ حالات اتنے نہیں بگڑے تھے۔ انٹرویو کئے گئے افراد متنوع پس منظر رکھتے تھے جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو لوگوں کی جان بچانے کے لئے سرکاری طور پر فرائض انجام دے رہے تھے اور زندگی بچانے کی کوششوں میں شامل تھے۔ ہم نے انٹرویو کو صرف مخصوص طبقے کے لوگوں تک محدود نہیں رکھا۔

دوسرا باب ان مُثبت تجربات پر مشتمل ہے جو کہ پاکستان میں آنے والے علاقوں میں مشاہدہ کئے گئے تھے اور جن میں لاہور اور فیصل آباد جیسے اس طرح کے شہروں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے جہاں مہاجرین بڑی تعداد میں موجود تھے۔

تیسرے باب میں وہ اہم نکات بیان کئے گئے ہیں جو کہ قبل از تقسیم کے ماحول کے حوالے سے کئے جانے والے انٹرویوز کے دوران منظر عام پر آئے۔

چوتھا اور آخری باب مستقبل کے لئے سفارشات اور اخذ کئے گئے نتائج پر مشتمل ہے۔

# حوالہ جات

1۔ تقسیم کے دوران نقل مکانی اور ہلاکتوں کے حوالے سے اعداد وشمار میں فرق پایا جاتا ہے، رگھوویندر اتنوار کی کتاب ''رپورٹنگ دی پارٹیشن آف پنجاب''، 1947ء نیو دہلی: منوہر 2006، صفحہ نمبر 39 پر ایک سے زیادہ مآخذ سے تخمینے دیئے گئے ہیں لہٰذا تقسیم کے حوالے سے مجموعی طور پر اعداد وشمار اور پنجاب کی تقسیم کے حوالے سے بھی اعداد وشمار حاصل کرنے کے لئے اس پر انحصار کیا جاسکتا ہے۔

2۔ واشنگٹن پوسٹ میں ایک بہترین مضمون بہ عنوان "India's Survivors of Partition Begin to Break Long Silence: Projects Documents Anguish of 1947 Split" March 12 2008

3۔ تقسیم کو ایک عظیم عہد قرار دینے کے حوالے سے کئے گئے تبصرے کے لئے دیکھئے Abid اور اس کے ساتھ ہی گیا ندرا پانڈے کی کتاب "Remembrning Partition"، 2001، صفحہ نمبر 13 ملاحظہ کریں تا کہ تقسیم کے مختلف پہلوؤں کی جامع وضاحت سامنے آجائے۔

4۔ اشیش نندی کا 18 فروری 2008 کو نیو دہلی میں لیا گیا انٹرویو

5۔ نندی کی کتاب "An Ambiguous Journey to the city"، نیو دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2001، دی گریٹ پارٹیشن: دی میکنگ آف انڈیا اینڈ پاکستان''، نیو دہلی، پینگوئن 2007، صفحہ 138 تا 141 ملاحظہ کریں تا کہ یہ پہلو واضح ہو کر سامنے آجائے کہ کس طرح غیر مسلموں نے مسلمانوں کی جان بچائی اور اسی طرح مسلمانوں نے بھی غیر مسلموں کو کیسے بچایا۔ اس طرح کی ایک مثال جس کا اس نے ذکر کیا ہے اور جس کا اور بھی بہت سے لوگوں نے ذکر کیا ہے وہ ڈاکٹر خوش دیوا سنگھ کی ہے جس نے مسلمان خاندان کے افراد کو بچایا تھا۔ اس کے علاوہ اس امر کی بھی اچھی طرح وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح اس دور کے خونی واقعات کی یلغار میں اچھے کام نمایاں ہونے سے رہ گئے۔

6۔ دیکھئے نندی کی کتاب "Ambiguous Journey to the City"، 2001، صفحہ 122۔

7۔ یاسمین خان، ''دی گریٹ پارٹیشن: دی میکنگ آف انڈیا اینڈ پاکستان''، 2007 صفحہ نمبر 138۔

8۔ آشیش نندی کا انٹرویو

9۔ مبارک علی کا انٹرویو

10۔ اعتزاز احسن کی ''انڈس ساگا''، نیو دہلی: رولی، 2005 اس نکتے کی اچھی طرح وضاحت کرتی ہے۔

11۔ دیکھیے اسی کتاب میں پیش لفظ، صفحہ نمبر 14

12۔ دیکھئے آئیان ٹالبوٹ کا تعارف "Lahore 1947" میں، مرتب کردہ احمد سلیم، 2001۔ اس کے علاوہ رابندر کور کی ''پنجابی مائیگرنٹس سنس 1947ء'' نیو دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2008، صفحہ 207۔212 بھی ملاحظہ فرمایئے تاکہ اس امر کی جامع وضاحت سامنے آجائے کہ تقسیم کے نتیجے میں بہت سے زندہ رہ جانے والے غیر مسلموں کے دلوں میں کس طرح نفرت پیدا ہوگئی جو ابھی تک ویسے ہی برقرار ہے۔

13۔ یاسمین خان''، ''دی گریٹ پارٹیشن: دی میکنگ آف انڈیا اینڈ پاکستان''، صفحہ نمبر 200

14۔ دی نیویارک ٹائمز سومنی سنگپتا 13 مارچ، 2005ء۔

15۔ ایم ایس وڑائچ، رتندر سنگھ بھنڈر سے انٹرویو۔

16۔ دیکھئے احمد 1۔ ''دی پالیٹکس آف گروپ رائٹس: دی سٹیٹ اینڈ ملٹی کلچرل ازم''، یونیورسٹی پریس آف امریکہ 2005، صفحہ نمبر 208۔

17۔ دیکھئے پاپیا گھوش کی کتاب ''پارٹیشن اینڈ دی ساؤتھ ایشین ڈایاسپورا''، 2007 صفحہ 124

18. نیئر اے، "Was Partition just one-generation trauma?"، دی ٹریبون، 17 اگست، 1997ء۔

19۔ سرحد کے دونوں جانب بہت سے افراد نے اس دلچسپ نکتے کا انکشاف کیا کہ پیروں فقیروں کے مزارات کو خواتین کی آبرو بچانے کے لئے استعمال کیا گیا اور کس طرح بہت

سے مولویوں یعنی پاکستان کے مسلمان اور انڈیا کے زیادہ تر سکھ مذہبی پیشواؤں نے بھی عورتوں کو پناہ دی۔

20۔ اس نکتے کی سمجھ کے لئے دیکھئے اشیش ناتندی کی کتاب "An Ambiguous Journey to the city"، 2001، صفحہ نمبر 123۔

21۔ ملویندر جیت سنگھ وڑائچ اور اندرا کھٹپالیا کا انٹرویو اس نکتے کو سمجھنے کے لئے بہت اہم تھا۔

22۔ ارشد مُغل سے انٹرویو

23۔ خالد حسین سے انٹرویو

24۔ دیکھئے جی ڈی کھوسلہ کی تحریر ''سٹرن ایکنگ'' صفحہ نمبر 296 جو کہ "Partition Omnibus"، 2007 میں شامل ہے۔

25۔ یاسمین خان کی ''دی گریٹ پارٹیشن: دی میکنگ آف انڈیا اینڈ پاکستان''، 2007، صفحہ نمبر 05

26۔ حوالے کے لئے دیکھئے پینڈرل مون کی تحریر "Divide and qiut" جو کہ کتاب "The Partition Omnibus" میں شامل ہے، صفحہ نمبر 77۔ امرتسر کے فسادات پر خضر حیات ٹوانہ کے استعفیٰ کے اثرات کے لئے دیکھئے آئیان ٹالبوٹ کی کتاب ''خضر ٹوانہ: دی پنجاب یونینسٹ پارٹی اینڈ دی پارٹیشن آف انڈیا''، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، 2002ء، کا باب نمبر 9، اس کے علاوہ "Epicentre of violonce: Partition voices and memories from Amritsar", جو کہ آئیان ٹالبوٹ اور درشن ایس تتلا کی مرتب کردہ ہے، 2006 تاکہ پاکستانی جھنڈے کو تار تار کر دینے کے ماسٹر تارا سنگھ کے فعل کے اثرات کا فہم حاصل کیا جا سکے۔

27۔ "The Partition Omnibus"، 2007 میں پینڈرل مون کی تحریر "Divide and quit" صفحہ نمبر 78 پر ملاحظہ فرمائیں۔

28۔ دیکھئے اسی کتاب میں صفحہ نمبر 80

29۔ ٹالبوٹ اور درشن ایس تتلا کی کتاب "Epicentre of violence: Partitnion voices and memornies from Amritsar", Delhi Permanent

Black 2006, Introduction P.6.

30۔ دیکھئے اسی کتاب میں صفحہ نمبر 7

31۔ دیکھئے اسی کتاب میں صفحہ نمبر 9

32۔ دیکھئے اسی کتاب میں صفحہ نمبر 11

33۔ دیکھئے دین این دتا کی ''پنجابی ریفیوبی اینڈ دی ارین ڈویلپمنٹ آف گریٹر دہلی''، جو کہ آر۔ای۔فریکنبرگ کی (مرتب کردہ) کتاب "Delhi through the ages: essays in Urban History, Society and culture" 1986 میں صفحہ نمبر 442 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

34۔ پپاوردی کی تحریر "Partrtion in transitnion: Comparative Analysis of Migration in Ludhiana and Lyallpur" جو کہ رائے این اینڈ بھاٹیا کی مُرتب کردہ کتاب "Partioned Lives : Narratives of Home, Displacesment and Resettlement", 2008 کے صفحہ نمبر 163 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

35۔ دیکھئے اسی کتاب (Ibid) میں

36۔ رگھوبیندر انوار سے انٹرویو:

37۔ پران نویل سے انٹرویو، علاوہ ازیں دی ڈیلی ٹائمز میں "Lahore Lahore eye: where Hindus and sikhs once lived" جنوری 07، 2007، از اے حمید بھی ملاحظہ فرمایئے۔

38۔ دی ڈیلی ٹائمز "Lahore Lahore aye: where Hindus and Sikhs once lived" از اے حمید، جنوری 07، 2007

39۔ پپاوِردی کی تحریر "Partition in Transition: Comparative Analysis of Migration in Ludhiana and Ly allpur" رائے این اینڈ بھاٹیا کی کتاب بہ عنوان "Partitioned lives: Narratives of Home, Disp lovement and Resettlement."

میں ملاحظہ فرمائیں۔

40۔ دیکھئے بٹالیہ کی تحریر "The other side of silence: Voices from the Partition of India, 1988 حوالہ کے لئے صفحہ نمبر 13 ملاحظہ کریں۔

41۔ ریند رسنگھ بھنڈر سے انٹرویو

42۔ حوالے کے لئے دیکھئے جوناتھن کریو، میکی بال اینڈ سپائزر کی مرتب کردہ کتاب "Acts of Memory: Cultural recall in the Past". کا صفحہ نمبر 8 ملاحظہ فرمایئے۔

43۔ دی جنگ "In the dust, in the breeze"، ۴ نومبر 2007 از ضیاء فرخ

44۔ خالد حسین سے انٹرویو

45۔ حوالے کے لئے ملاحظہ کریں میانی ٹی ایس کی ''ساؤتھ ایشیاء کوآپریشن اینڈ دی اول آف دا پنجابز''، 2007 صفحہ نمبر 73 تا 74 اور اس کے ساتھ ہی دیکھئے انڈین ایکسپریس کا مضمون "The ties that bind"، مورخہ 25 اپریل 2008، از تری دیوش سنگھ میانی۔

46۔ جاٹ ذاتوں پر معلومات کے لئے دیکھئے، ابٹسن ڈینزل کی تحریر ''اے گلاسری آف داٹرائبز اینڈ کاسٹس آف ویسٹ پنجاب اینڈ نارتھ ویسٹرن فرنٹیئر پراونس'' 1970

47۔ دیکھئے آیان ٹالبوٹ کے الفاظ ''خضر ٹوانہ: دی پنجابیونینسٹ پارٹی اینڈ دی پارٹیشن آف انڈیا''، 2002 صفحہ نمبر 15 پر

48۔ جاٹوں کے درمیان مُشترکہ موروثی ناموں کے استعمال کی وضاحت ''خضر ٹوانہ: دی پنجاب یونینسٹ پارٹی اینڈ دی پارٹیشن آف انڈیا''، 2002 صفحہ نمبر 15 پر دی گئی ہے۔ اسلام، ہندوازم اور سکھ دھرم قبول کر لینے کے واقعات کی سمجھ کیلئے بھی ابرٹسن کا تعارف دیکھئے۔

49۔ ریتند رسنگھ بھنڈر سے انٹرویو

50۔ دی نیشن میں ''جٹکا ڈپلومیسی'' یکم اپریل 2005، از ایم اے نیازی ملاحظہ کریں۔

51۔ دی ڈان ''پی ایم ایل۔ کیو اینڈ دا مہاراجہ'' 5 فروری 2008، از عامر متین۔

52۔ پال برس مین کی تحریر بہ عنوان "Relatives and the Kindred in the Punjabi kinship system" ملاحظہ فرمائیں پیٹر یشیا اوبرائے کی کتاب "Family kinship and Marriage in India" نیو دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1993 میں

53۔ واپورٹ ایس کی تحریر Shameful Flight:The Last Years of British Empire in India, 2006

54۔ تنوار رگھوویندرا کی ''رپورٹنگ داپارٹیشن آف پنجاب'' 2006، صفحہ نمبر 548

55۔ ہربھجن سنگھ سے انٹرویو، نیو دہلی

56۔ بلویندر سنگھ سے انٹرویو، نیو دہلی

57۔ مسز اونا ہائرمتھ (Oona Hiremalh) سے انٹرویو میں ماسٹر روشن لال کی مثال کے وضاحت کی گئی۔

58۔ رگھوویندرا تنوار سے انٹرویو

59۔ دیکھئے "Lahore 1947"، 2006، صفحہ نمبر 83

60۔ خالد حسن سے انٹرویو

61۔ اندرا کٹھیالیا اور ایس ایس چوہدری سے انٹرویو کے نتیجے میں سامنے آنے والے نکات اور ان کی اروشی بٹالیہ کی طرف سے "The other side of silence"، 1998ء میں بہترین وضاحت۔

62۔ ملاحظہ فرمایئے رگھوویندرا تنوار کی ''رپورٹنگ داپارٹیشن آف 1947''، 2006، صفحہ نمبر 596۔

63۔ اندرا کٹھیالیا سے انٹرویو

64۔ اسی کتاب کے اندر اور تھوہا، خالصہ کے واقع کے لئے دیکھئے اروشی بٹالیہ کی تحریر بہ عنوان "The other side of silence" 1998، صفحہ نمبر 46

65۔ اردمان سنگھ ڈھلون سے انٹرویو

66۔ دیکھئے پال آر براس کی تحریر

"The Partition of India and Retributive Genocide in the Punjab, 1946-47: Mean, Methods, and Purpose", Journal of genocide Research, Vol.5, No.1(2003)

صفحہ نمبر 94 پر

67۔ ملاحظہ کریں آیان ٹالبوٹ اینڈ درشن تتلا کی "Epicentre of violence: Partition voices and memories from Amritsar", 2006 صفحہ نمبر 07

68۔ بریگیڈیئر ایس ایس چوہدری، جوگندر سنگھ کوہلی سے انٹرویو

69۔ چوہدری محمد اشرف سے انٹرویو

70۔ پرابھجوت کور سے انٹرویو

71۔ دیکھئے میانی ٹی۔ایس کی ''ساؤتھ ایشین کوآپریشن اینڈ دا رول آف دا پنجاب''، صفحہ نمبر 84 اور اس کے ساتھ ہی دیکھئے احمد 1 ''لاہور ایفیکٹ''، سیمینار نمبر 567، 2006، نیو دہلی، میں نے یہ صورتحال بچشم خود ملاحظہ کی ہے۔

74۔ ڈی ٹریبون "Gah Ecstatic, wisher Manmohan well" 22 مئی، 2004

75۔ دی ہندو میں مضمون بہ عنوان "Atale of two prime Ministers: First flag and first PM" مورخہ 12 اگست، 2004 از ویوک شکلا

76۔ انڈین ایکسپریس میں 13 دسمبر، 1997ء کو چھپنے والا مضمون "Good intentions, bad doctrine" از آبھا ڈکشٹ،

77۔ دی ڈیلی ٹائمز میں 17 مارچ 2005 کو چھپنے والا مضمون بہ عنوان "Amarindar praises Pakistan's efforts to fortify ties with India"

78۔ دی ٹریبون میں 17 اگست، 2003 کو شائع ہونے والا مضمون بہ عنوان "More than a bus it is a bridge of faith"

# (2) انڈیا کے تجربات

اس وقت دہلی، امرتسر، چندی گڑھ، لدھیانہ اور کرک شیترا جیسے شہروں میں سکونت پذیر افراد کے پاس سنانے کے لئے انسانی ہمدردی کے بے شمار دلچسپ واقعات ہیں اور قدرت کی ستم ظریفی سے وہ جن مکانوں میں رہائش پذیر ہیں وہ دراصل مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے ہیں۔

## بریگیڈیئر ایس ایس چودھری: انسانیت کا سپاہی

بریگیڈیئر ایس ایس چودھری آسام رجمنٹ کا ایک ریٹائرآرمی آفیسر ہے اور چندی گڑھ میں رہائش پذیر ہے۔ تقسیم سے قبل وہ آٹھویں پنجاب رجمنٹ میں تھا جو کہ اب بلوچ رجمنٹ میں ضم ہو چکی ہے۔ فسادات کے دوران وہ پنجاب پولیس میں عارضی طور پر خدمات سرانجام دے رہا تھا اور روہتک سے حُسینی والا تک مسلمانوں کے انخلا کی نگرانی کا ذمہ دار تھا۔ اگرچہ بہت سے ہندوؤں اور سکھوں نے جو پاکستان سے نئے نئے وہاں منتقل ہوئے تھے اس پر دباؤ ڈالا کہ چونکہ اُنہیں مغربی پنجاب میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے جوابی کاروائی کے طور پر وہ انہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی اجازت دے دے، مگر اُس نے یہ کہہ کر دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا کہ بطور ایک فرض شناس سپاہی اور سکھ کے وہ اُنہیں کسی صورت میں معصوم لوگوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دے گا۔ (1) خوش قسمتی سے اسے پاکستان کا دورہ کرنے کا موقع مل گیا تھا مگر وہ کبھی کہوٹہ کا دورہ نہ کر سکا کیونکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا مرکز ہونے کی وجہ سے وہ پابندیوں کی زد میں تھا۔ اس کی بیوی درشن چوہدری کا تعلق لاہور سے ہے اور اس کے دورۂ لاہور کے موقع پر وہ اُس کے ہمراہ تھی۔

بریگیڈیئر چوہدری کا آبائی گاؤں کہوٹہ (اگرچہ وہ خود کُلو، ضلع کانگڑھ میں جو کہ اب ہماچل پردیش کا حصہ بن چکا ہے، جنوری 1923 میں پیدا ہوا تھا) ہے اُس نے 1944ء میں فوج

میں شمولیت اختیار کر لی اور 1945ء کے اواخر یا 1946ء کے اوائل میں اس کی تعیناتی آٹھویں پنجاب رجمنٹ کے مرکز لاہور میں ہوگئی۔ بریگیڈیئر کے ذہن میں ابھی تک کرپس مشن کی طرف سے 1946ء کے اوائل میں اُس کی رجمنٹ کے دورے کی یادیں تازہ ہیں اور اس کے بقول اس وقت 60 فیصد فوجی آفیسر برطانوی تھے۔ اس دور میں آفیسرز کے اندر اپنی رجمنٹ کے ساتھ وابستگی کا ایک بلند درجے کا عمومی جذبہ اور ہندوستانی فوجیوں کے اندر آپس میں بھائی چارے اور دوستی کا ایک خصوصی جذبہ پایا جاتا ہے۔

وطن کی اہمیت پر زور دیتے ہو بریگیڈئر کہتا ہے، ''مجھے تحصیل کہوٹہ کے وی سی روز اور او آر ایس کے ساتھ گھلنا ملنا ہمیشہ ہی اچھا لگتا تھا۔ مینجر نذر شائستہ محمد خان جو سٹاف کالج کوئٹہ میں میرے بھائی کے ساتھ کام کرتا رہا تھا مجھ سے ہمیشہ بڑی خوش خلقی اور اپنائیت کے ساتھ پیش آتا۔''

1946ء کے وسط میں بریگیڈیئر ایس ایس چوہدری کو، جو اس وقت کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا، تبادلہ کر کے عراق میں شاہرہ کے مقام پر تعینات برطانوی فوجی دستوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ شاہرہ بصرہ سے 25 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ بعدازاں اُس کا تبادلہ کر کے کمانڈ اینڈ سپلائی ڈپو میں تعینات کر دیا گیا جس کی سربراہی ایک پنجابی مسلمان میجر جی۔ آر مرزا کے پاس تھی۔ تھوڑے ہی عرصے کے اندر اندر بریگیڈیئر چوہدری اور مرزا کے درمیان تعلق گہری دوستی میں بدل گیا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ہندوستان کی تقسیم اور مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک دیئے جانے کی خبر گردش کرنا شروع ہوگئی تھی، مسلم اور غیر مسلم افسروں کے مابین تعلقات کی گرمجوشی میں کمی نہیں آئی تھی۔ بعدازاں جب فسادات پھوٹ پڑے اور مارچ 1947ء کے بعد ہلاکتوں کا سلسلہ زور پکڑ گیا تو بھی فوجی طعام گاہوں اور انجمنوں (Clubs) کے اندر ناخوشگوار مباحثوں سے اجتناب برتا جاتا رہا۔ برطانوی حکمرانوں نے فوج کے اندر نظم وضبط اور دوستانہ ماحول کو برقرار رکھا۔

اس عرصے کے دوران، بقول بریگیڈیئر چوہدری ''میجر بی آر مرزا نے ہم سب کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے میں غیر معمولی جذبے کا مظاہرہ کیا۔ آخر کار میری درخواست پر مجھے ورسوا (Versova) نامی بحری جہاز پر بٹھا کر دوبارہ انڈیا بھیج دیا گیا۔ تمام تر تناؤ کے باوجود میجر مرزا نے مجھے بہت گرمجوشی سے الوداع کہا۔ ہماری زندگیوں کو لاحق خطرات کے باعث ہمیں کراچی اُترنے

کی اجازت نہ دی گئی اور سیدھا بمبئی روانہ کر دیا گیا اور پھر ہم نے اپنی تعیناتی کے لئے ہیڈ کوارٹر رجوع کیا۔ ان دنوں تقسیم کے ساتھ ہی ریڈکلف لائن کی دونوں طرف غیر معمولی فسادات کی وجہ سے فوجی افسران کی تعیناتیوں اور تبادلوں کے احکامات کسی خاص منصوبہ بندی کے بغیر ہی جاری کئے جارہے تھے۔ آکنلک (Auchincleck) ابھی تک پاکستانی اور انڈین فوج دونوں کا سربراہ تھا۔ مختلف فرائض بشمول امن وامان کی بحالی کے فرائض کی انجام دہی کے لئے ان دنوں فوجی افسروں کی طلب بہت زیادہ تھی۔ مجھے درجنوں جوان افسروں کے ساتھ عارضی تعیناتی پر پنجاب پولیس میں خدمات سرانجام دینے کے پنجاب حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔''

پنجاب پولیس کے لئے اپنے انتخاب کے حوالے سے یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''جالندھر میں واقع پنجاب گورنمنٹ کے ہیڈ کوارٹر میں گورنر چنڈولال تری دیوی کو انٹرویو دے چکنے کے بعد مجھے پنجاب پولیس کے ملازم کے طور پر روہتک میں ایڈیشنل ایس پی لگا دیا گیا۔ ان دنوں روہتک کا ایس پی ایک تجربہ کار پولیس آفیسر رائے بہادر سنت رام کپور تھا جبکہ مسٹر این این کیشیب، آئی سی ایس ڈی سی کے فرائض سنبھالے ہوئے تھا۔ میرے اور ڈی سی اور ایس پی کے درمیان ایک تفصیلی ملاقات اور تبادلہ خیال ہوا۔

اپنے فرائض کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بریگیڈیئر چوہدری نے کہا کہ ''یہ طے ہو گیا تھا کہ میں ضلع سے مسلمان مہاجرین کے پُرامن انخلاء کے لئے ذمہ دار ہوں گا۔ ان کی اکثریت رانگڑوں پر مشتمل تھی اور ان کا تعلق بشمول کالا مور 12 دیہاتوں سے تھا۔ اُس دور کے بہت سے نوجوان افسروں کی طرح میں اپنے فرائض پورے خلوص اور دیانتداری سے ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ 1945 سے 1946ء تک لاہور میں میرے قیام کا نتیجہ حضرت میاں میر کے فراخدلانہ اور تعصب سے پاک خیالات کی پہلے سے بہتر سمجھ کی صورت میں نکلا۔ (2) لہٰذا اس حقیقت کے باوجود کہ خود میرے اپنے خاندان کو کہوٹہ سے نکال باہر کیا جارہا تھا جو کہ بدترین فسادات کی زد میں آنے والے علاقوں میں سے ایک تھا، میرے دِل میں کسی بھی فرقے کے خلاف کوئی تعصب پیدا نہیں ہوا۔ ستمبر 1947ء کے اواخر کے الگ بھگ جبکہ 12 عدد رانگھڑ مسلم دیہاتوں سے مسلمانوں نے قافلوں کی صورت میں روہتک کے قریب سے نکل کر حسینی والا کی طرف کوچ کرنا شروع کیا تو مجھ سے کچھ ہندو مہاجروں نے جو کہ ملتان ڈویژن سے آئے ہوئے

تھے جو کہ شدید فسادات کی لپیٹ میں تھا'' رابطہ کر کے درخواست کی کہ میں مسلمانوں کو غیر مسلح کردوں تا کہ ہندوان کے قافلوں کو لُوٹ سکیں''۔

تاہم اُس نے مسلمانوں کو ہر حال میں بچانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ بقول بریگیڈیئر چوہدری:

''میں نے اپنے پاؤں زمین پر مارے اور اُنہیں بالکل واضح کر دیا کہ مسلمان مہاجرین کو محفوظ راستہ دینا میرے فرائض میں شامل ہے۔ ان معصوم مسلمانوں کو ایک یا دو مرتبہ محفوظ راستہ دیتے ہوئے ہمیں فائرنگ بھی کرنی پڑی۔ آخر کار مہاجرین کو بالکل محفوظ و مامون طور پر حُسینی والا پہنچا دیا گیا۔''

1948ء کے اواخر میں اُس کو دوبارہ آرمی ہیڈ کوارٹر میں تعینات کر دیا گیا۔ پُرانی انڈین آرمی کے اثاثوں کی پاکستان اور انڈیا کے درمیان تقسیم عمل میں لائی جا رہی تھی جس کی نگرانی مجموعی طور پر سر کالاڈ آکنلک کے ہاتھوں میں تھی۔ عمومی لحاظ سے فوج کی کارکردگی ٹھیک جا رہی تھی۔

1949ء میں بریگیڈیئر چوہدری کی تعیناتی بطور اجوٹنٹ آسام رجمنٹ سنٹر شیلانگ میں کر دی گئی۔ بعد ازاں بریگیڈیئر ایس ایس چودھری نے جنوری 1963ء میں پانچویں آسام رجمنٹ پروان چڑھائی اور 1965ء کی جنگ کے دوران ڈیرہ بابا نانک کے علاقے میں اپنی بٹالین کی کمانڈ کے فرائض سرانجام دیئے۔

1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران اپنے فرائض سرانجام دیتے ہوئے وہ یہ جاننے کی پوری کوشش کرتا تھا کہ آیا مخالف فریق کی سمیت اس کا کوئی سابقہ رفیق کار تو موجود نہیں ہے۔ چودھری کے بقول ''1965 کی جنگ کے دوران میں یہ جاننے کے لئے بے چین رہتا تھا کہ آیا مخالف سمیت میں میرا کوئی سابق رفیق کار تو موجود نہیں ہے'' اس حقیقت کے باوجود کہ انڈیا اور پاکستان ایک دوسرے کے اتنے سخت دُشمن تھے اُس کے ذہن میں ہی تجسس یا بے چینی رہتی تھی کہ دوسری جانب کہیں اُس کا کوئی پرانا رفیق اس کی زد میں نہ آ جائے۔

یاسمین خان نے بھی اُس کے جذبات کو بڑے خوبصورت انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔(3)

''تقسیم کے چند ایک انوکھے اور عجیب پہلوؤں میں سے ایک یہ پہلو یہ تھا کہ بیسویں صدی کی جنگوں میں کشمیر کی لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب ایک دوسرے کے مقابل

پاکستانی اور انڈین فوجوں کے بڑے بڑے افسروں کی پہلی اور دوسری نسلوں میں سے بہت سی شخصیات ایک دوسرے کی رفیق کار رہی تھیں آزادی سے پہلے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کرتی رہی تھیں۔''

ریٹائرمنٹ کے بعد بریگیڈئر چوہدری کو کچھ عرصہ تک پاکستان کا دورہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، حالانکہ اُس کی کچھ ایسے پاکستانیوں سے شناسائی بھی ہوگئی تھی جن سے اُس کی چندی گڑھ کانفرنس کے دوران ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک چوہدری محمد اشرف بھی تھا جو کہ ایک ریٹائرڈ پاکستانی سول سرونٹ تھا اور دونوں کی آپس میں گہری دوستی ہوگئی۔ چنانچہ بعد میں چودھری کے لاہور کے دوروں کے دوران وہ اس کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اشرف کا تعلق جس گاؤں سے ہے وہ چوہدری کے آبائی گاؤں کے نزدیک واقع ہے۔ جب اوّل الذکر سے یہ سوال کیا گیا کہ اس کی چودھری سے کس طرح ملاقات ہوئی تو اس کے الفاظ یہ تھے: (4) ''میری بریگیڈیئر چوہدری سے پہلی ملاقات جون 2004ء میں چندی گڑھ کے ایک ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں ہم ایک سیمینار میں شرکت کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ سیمینار ورلڈ پنجابی کانگریس کے زیر اہتمام کرایا گیا تھا چائے کے وقفے کے دوران ہماری اتفاقی ملاقات ہوئی اور ہم فوراً ہی اپنی پوٹھوہاری زبان میں باتیں کرنے لگ گئے۔ بریگیڈیئر چوہدری نے بڑی گرمجوشی اور خلوص کے ساتھ مجھے ایک قابلِ احترام خاندانی بزرگ کی طرح گلے سے لگایا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ان دونوں کے لئے وطن کا بندھن بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ بقول اشرف ''ایسا تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ میری اپنے آبائی علاقے سے تعلق رکھنے والے کسی شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے ہوئے اتنی گرمجوشی اور اشتیاق سے اپنے پُرانے دنوں کو یاد کرتے رہے کہ میرے دل پر اس گفتگو نے بہت گہرے اثرات مُرتب کئے۔ یقیناً ہم نے آپس میں تعارفی کارڈز کا تبادلہ بھی کیا مگر اس کے مزید کوئی رابطہ نہ ہوسکا کیونکہ ہمارا گروپ اگلے ہی روز دہلی روانہ ہو رہا تھا۔''

بعدازاں اشرف نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ دونوں کے مابین تعلقات کی تجدید کس طرح ہوئی تھی۔ ''ایک برس کے بعد، محض پھر خوش قسمتی سے میری ملاقات گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈاکٹر گورپیت مینی (بریگیڈیئر چوہدری کی بیٹی) سے ہوئی جو کہ وہاں کسی لیکچر کے سلسلے

میں آئی ہوئی تھی۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ بریگیڈیئر چوہدری کی بیٹی تھی اور خوش قسمتی سے اس کے والدین بھی شہر میں ہی تھے۔ بعدازاں اسی شام کو یا شاید اگلے دِن وہ سب ہمارے گھر ملاقات کے لئے موجود تھے۔ باقی، وہ جو کہتے ہیں، سب کچھ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔''

بریگیڈیئر کو پاکستان کا دورہ کرنے کا پہلا موقع جنوری 2006ء میں ملا۔ اُس نے لاہور، ننکانہ صاحب، پنجہ صاحب اور اسلام آباد کا دورہ کیا۔ اس دورے کے حوالے سے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے اُس نے کہا: ''مجھے مختلف دوستوں کی میرے اور میرے اہل خانہ کے لئے گرمجوشی اور تپاک کے مظاہرے نے بہت متاثر کیا۔'' اُس کی یہ بھی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی رجمنٹ کے مرکزی دفاتر کا دورہ کرے مگر اسے یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ اُس کی سابقہ آٹھویں پنجاب رجمنٹ بلوچ رجمنٹ میں ضم ہو چکی تھی اور اب باقی نہیں رہی تھی۔ اسی طرح اُسے اپنے پُرانے دوستوں، مثلاً جی۔ آر مرزا کا سُراغ لگانے میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اُس نے لاہور کا دوسرا دورہ فروری 2007ء میں کیا اور واہگہ کے اس طرف پنجابیوں کی گرم جوشی اور مہمان نوازی نے اسے ایک مرتبہ پھر متاثر کر کے رکھ دیا۔ اس دورے کے دوران اسے چند ایک ریٹائرڈ آرمی آفسروں سے ملاقات کے ساتھ ہی کہوٹہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے میل جول کا موقع بھی فراہم ہو گیا۔

اُس کی شریک حیات درشن چوہدری کو بھی 60 برس بعد اپنے آبائی شہر لاہور کا دورہ کرنے کا موقع میسر آیا تھا۔ اُس کے والد مسٹر اجیت سنگھ کالہا متحدہ پنجاب کے محکمۂ آبپاشی میں انجینئر تھے اور ان کا خاندان ہر برس گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے شملہ چلا جاتا۔ 1947ء میں بھی گذشتہ برسوں کی طرح ان کا خاندان شملہ چلا گیا تھا۔ اور انہی چھٹیوں کے دوران ہی انہیں شملہ میں پتہ چلا کہ ملک کی تقسیم ہو رہی تھی اور وہ واپس لاہور نہیں جا سکتے تھے کیونکہ وہ پاکستان میں شامل ہو چکا تھا۔ کالہا خاندان اپنے ساتھ جو اکلوتا ساز و سامان لے آئے تھے وہ محض ساگوان کی چند کرسیاں تھیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی ایک مسلمان گھریلو ملازمہ عالم بی بی تقسیم کے بعد بھی دو برس تک ان کے ہمراہ رہتی رہی، مگر جلد ہی لوگوں نے انہیں یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ مسلمان ملازمہ کو اپنے ہاں نہ رکھیں۔ اگرچہ عالم بی بی ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر اُسے وہاں سے نکلنے پر مجبور

کر دیا گیا اور مسٹر اجیت سنگھ کا ہلا اُسے سرحد تک خود چھوڑ کر آئے تھے۔

اردمان سنگھ ڈھلوان: جس کے خاندان کے لئے انسانیت بہت اہمیت رکھتی تھی۔

اردمان سنگھ ڈھلون جو کہ اب 68 برس کا ہو چکا ہے۔ ایک سینئر پنجاب گورنمنٹ آفیسر کے طور پر ریٹائرڈ ہوا تھا، اُس نے تقسیم کے حوالے سے چند ایک تحقیقی مقالے پیش کئے ہیں جن میں اُس نے اپنے خاندان کی تاریخ پر خصوصی زور دیا ہے۔ اُس کا تعلق پنجاب کے ایک ممتاز سیاسی گھرانے سے ہے۔

ڈھلون کی کہانی نہ صرف اس حقیقت کی بناء پر دلچسپ ہے کہ اُس کے دادا نے جھوبال، دیال بھڑنگ اور کچھ اور ملحقہ دیہاتوں کے مسلمانوں کو بچایا تھا بلکہ اس لئے بھی اس کی والدہ پر ضلع امرتسر میں مسلمان عورتوں کی بازیابی کی ذمہ داری آپڑی تھی۔ اُس نے ایک ایسی تنظیم بھی قائم کی تھی جس نے مشرقی پنجاب میں مسلمان عورتوں اور بچوں کی بازیابی میں معاونت کی تھی۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ان کے مسلمان ملازموں میں سے ایک نے تقسیم کے بعد بھی ان کے ہاں قیام جاری رکھا۔

اپنے خاندانی پسِ منظر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈھلون نے بتایا کہ:

''میرے دادا کو امرتسر کے جنوب مغرب میں واقع آبائی گاؤں جھوبال اور شمال میں واقع دوسرے گاؤں دیال بھڑنگ میں 350 ایکڑ زمین ورثے میں ملی تھی۔ میرے پردادا برطانوی فوج میں کیولری آفیسر تھے۔ اُنہوں نے برطانوی پولیس میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور شمال مغربی صوبے میں نو برس تک ملازمت کرنے کے بعد 1919 میں جلیانوالہ باغ کے سانحے کے نتیجے میں قوم پرستی کی بھڑکتی ہوئی آگ کے باعث وقت سے پہلے ہی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اُنہوں نے اپنے دو نوجوان بھائیوں کے ساتھ مل کر کانگریس کی قیادت میں چلنے والی تحریکِ آزادی اور گوردوارہ ریفارم (اکالی) تحریک میں شمولیت اختیار کر تھی اور وہ گاندھی کی قیادت میں چلنے والی ستیا گرہ میں بھی پیش پیش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں کئی بار جیل میں جانے کے ساتھ ہی جائیداد کی ضبطی جیسی سزاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میرے دادا جی نے اپنے چھوٹے بھائی کو شیرومنی اکالی دل (SAP) کا پہلا صدر بھی مقرر کر دیا تھا اور اُنہوں نے یہ عہدہ پانچ برس کے عرصے کے لئے اس وقت تک سنبھال رکھا جب تک کہ گوردوارہ ایکٹ نافذ

نہیں کر دیا گیا۔ وہ بذات خود بھی ضرورت پڑنے پر ایس بی پی سی اور ایس اے ڈی کی قائم مقام صدارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ 1937ء میں اُنہوں نے پنجاب پراونشل کانگریس کمیٹی کی صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ میرے والدین باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر تھے اور ہمارے دوسرے گاؤں کے قریب فتح گڑھ چوڑیاں میں خیراتی ہسپتال بھی چلا رہے تھے۔ وہ میرے نانا کے اس حکم کی تعمیل کر رہے تھے جس کے تحت اُنہوں نے مہاتما گاندھی کی اس پکار کی پیروی کرنے کا کہا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ برطانوی ملازمتیں چھوڑ کر اس کی جگہ دیہاتوں میں خدمات انجام دیں۔ 1946ء میں میرے دادا نے میری والدہ کو مجبور کیا کہ وہ کانگرس کے ٹکٹ پر متحدہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کا الیکشن لڑیں۔ وہ اس وقت کے بعد 20 برس تک قانون ساز اسمبلی کی رُکن رہیں اور بعد ازاں کانگرس کی دو کابیناؤں میں وزیر صحت، سماجی بہبود و تعلیم بھی رہی تھیں۔ وہ بہت سی انتظامی مجلسوں، انجمنوں وغیرہ کی رُکن بھی رہی ہیں۔ میں خود ایک سینئر پنجاب گورنمنٹ آفیسر کے طور پر ریٹائر ہوا ہوں جبکہ میری شریک حیات گورونانگ دیو یونیورسٹی امرتسر میں گورنانک دیو سٹڈیز کے شعبے کی سینئر ترین پروفیسر ہیں۔

اپنے دادا امر سنگھ کے کردار کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہ اُنہوں نے کس طرح مسلمانوں کی جان بچائی، ڈھلون یوں گویا ہوتا ہے:(5)

''ہمارے دیہات اور اس سے ملحقہ گاؤں کے کچھ معروف مسلمان میرے دادا امر سنگھ سے ملنے آئے اور ان خدشات کا اظہار کیا کہ سکھوں کے کچھ گروہ جو دور دراز دیہاتوں میں مسلمانوں پر حملے کرتے رہے ہیں وہ ہمارے اور ملحقہ دیہاتوں کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اگلی صبح اُنہوں نے اس علاقے کے تقریباً تمام دیہاتوں کی ممتاز سکھ شخصیات سے ملاقاتیں کرنی شروع کر دیں تاکہ اس طرح کے مظالم کے خلاف سکھوں کی رائے مستحکم کی جا سکے۔ یہی کچھ اُنہوں نے ہمارے آبائی گاؤں جھویال کے ملحقہ دیہاتوں میں کیا۔ تاہم زیادہ وقت نہیں گزرا کہ سکھوں کے بڑے بڑے گروہوں نے نزدیکی دیہاتوں چک سکندر اور مدد چھانگا وغیرہ میں لوٹ مار اور قتل و غارت کی کاروائیاں شروع کر دیں۔ بہت سے مسلمان مارے گئے اور چند ایک لڑکیوں کو اغواء کر لیا گیا۔ باقی ماندہ پنجاب میں بھی حالات اچھے خاصے بگڑ گئے تھے۔ مہاجرین کی لاشوں سے بھری ہوئی ٹرینوں کی امرتسر میں

وصولی اور وہاں سے پاکستان بھجوانے کی خبریں ہر طرف پھیل چکی تھیں جس کے باعث فضا میں تناؤ پایا جاتا تھا۔ ہمارے بعض خیر خواہوں نے ہمارے خاندان کو پے در پے اس طرح کے پیغامات بھجوائے کہ بعض لوگ جو میرے دادا کی سرگرمیوں سے جھنجھلا چکے تھے ہمارے سارے خاندان کو ہلاک کرنے اور اس کا الزام مسلمان جنونیوں کے سر منڈھ کر اس بہانے ہمارے اور ملحقہ دیہاتوں کے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے ہیں۔ ہمیں احتیاطی تدبیر کے طور پر اپنے نانا کے گاؤں بھجوا دیا گیا اور چونکہ ہمارے والدین امرتسر میں حکومت کے ساتھ مل کر مہاجرین کو سہولیات کی فراہمی کے اقدامات کرنے میں مصروف تھے اس لیے ہم ان کے بغیر ہی وہاں سے چل پڑے۔ ہماری والدہ کو مقامی نمائندہ اسمبلی کے طور پر خواتین کے لئے مہاجر کیمپ قائم کرنے اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ تاہم میرے دادا جان نے لوٹ مار کرنے والے گروہوں کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے سے انکار کرتے ہوئے خود اپنے اور ملحقہ دیہاتوں کے مسلمانوں کی حفاظت کی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ پولیس اور مسلح افواج کو آگاہ کرنے کے ساتھ ہی ہم خیال لوگوں کی مقامی دیہی کمیٹیوں کی وساطت سے حفاظتی اقدامات اور سخت کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کو بھی مناسب طور پر تنبیہ اور ہدایات جاری کر دی گئیں۔''

اگرچہ ڈھلون کو صحیح طرح سے تو یاد نہیں ہے کہ یہ واقعات کن تاریخوں کے دوران پیش آئے تھے، تاہم غالباً یہ سب کچھ اگست کے تیسرے ہفتے کے دوران ہوا تھا۔

وہ مزید کہتا ہے کہ: (6)

''چند ہفتوں بعد پولیس اور دیگر دفاعی ادارے اسے اور باقی سب کو بھی یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ تمام مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہجرت ان حالات میں ناگزیر ہو چکی تھی، لہٰذا انہیں بحفاظت پاکستان پہنچانے کی منصوبہ بندی کی جا چکی ہے۔ ہمارے اور چند ایک ملحقہ دیہاتیوں کے مسلمان اُسی دن ہی چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں اور چند ایک مسلح سکھوں کی نگرانی میں سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ مسلمانوں کو بھی زیادہ سے زیادہ اسلحہ اُٹھانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ تاہم راستے میں ہی چند ایک ایسے مسلح سکھ گروہوں نے ان پر حملہ کر دیا جنہیں کسی نہ کسی طرح ان کی روانگی کی خبر مل گئی تھی۔ حفاظتی مقصد کے لئے ساتھ جانے والے دستے مقابلے میں ڈٹ گئے تاہم روشن نامی ایک مسلمان لوہار کو (جس کے بارے میں شُبہ تھا کہ وہ بم تیار کرنے

والے ایک مسلمان گروہ کا سرغنہ تھا) ان کے حوالے کرنے کے سمجھوتے کے باعث ایک خونی فساد واقع ہونے سے روک دیا گیا۔ ہمارے اور دیگر ملحقہ دیہاتوں کے تمام مسلمانوں میں سے صرف روشن لوہار ہی تھا جو راستے میں مارا گیا۔''

ڈھلون خاندان کا ایک مسلمان ملازم بابا گلاب ان کے ساتھ ہی رہنے پر بضد رہا اور وہاں سے نہیں گیا:(7)

''تاہم، بابا گلاب نے، جس کا کوئی خاندان نہیں تھا اور وہ ان دنوں سے ہی ہمارے ساتھ رہ رہا تھا جن دنوں میرے دادا جی پولیس میں خدمات انجام دے رہے تھے، وہاں سے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ آخر تک نہیں گیا وہ ہمیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کر سکتا تھا اور غالباً واحد شخص تھا جو میری دادی اماں سے کھلم کھلا لڑائی کر سکتا تھا۔ وہ روزانہ نماز پڑھتا تھا اور جب کئی برس پہلے اُس کا انتقال ہو گیا تھا تو اسے سب سے زیادہ آہوں، سسکیوں اور احترام کے ساتھ دفنایا گیا تھا۔''

ڈھلون کی والدہ بھی مشرقی پنجاب میں خواتین کی بازیابی کے حوالے سے بہت متحرک رہی تھیں:(8)

''بازیابی کے لئے ایک تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی بنیاد امرتسر میں رکھی گئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ سکھوں اور ہندوؤں کی جانب سے اغواء کئے گئے بچوں اور عورتوں کو بازیاب کروا کر انہیں پاکستان روانہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ ان اغواء شدہ ہندو اور سکھ بچوں و عورتوں کو بھی واپس انڈیا لایا جائے جنہیں پاکستانی حکومت کی طرف سے اسی طرح کی قائم کی گئی تنظیم کی جانب سے بازیاب کروایا جائے گا۔ ہماری والدہ پرکاش کور کو امرتسر آفس کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ بی بی اُمت السلام کو پنجاب کا مُنتظم جبکہ محترمہ مریدُ ولا سارا بھائی کو جس کا تعلق گجراتی سارا بھائیوں کے مشہور دواساز ادارے سے تھا، قومی سطح کا منتظم مقرر کر دیا گیا۔ بعدازاں بی بی امت السلام کی طرف سے راجپورہ میں گاندھی سیوا آشرم کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں بحالی کے لئے قائم کردہ تنظیموں کے لئے کام کرنے والے معاون رضا کاروں کو اس طرح کی تعلیم اور تربیت دی جاتی جس سے ان کو سرکاری اداروں میں ملازمت مل سکے۔ اُنہوں نے جن مسلمان خاندانوں کی مدد کی تھی ان کی اکثریت نے انہیں کئی برسوں تک یاد رکھا اور ان کی مہربانیوں کے اعتراف پر مبنی خطوط بھی لکھے۔ میرے دادا جان کو بھی ہمارے اپنے اور ملحقہ

دیہاتوں کے ان مسلمانوں کے بے شمار خُطوط موصول ہوتے رہے جن کو اُنہوں نے پاکستان بحفاظت پہنچوانے میں مدد فراہم کی تھی۔

خواتین کی بازیابی کے حوالے سے کوششیں کرنے والے کو درپیش مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ:

''بازیابی کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کی راہ میں اہم رکاوٹ سماجی مسائل کی تھی۔ عام مفہوم میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواتین کو اغواء کرنے والے افراد اُنہیں یہ حق دینے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ وہ خود یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ اُن کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں یا واپس اپنے رشتے داروں کے پاس جانا چاہتی ہیں۔ اگرچہ بہت سی ایسی خواتین نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا، جن کو یہاں زیادہ بدتر صورتحال کا سامنا تھا بہ نسبت اس کے کہ جو کہ ان کے خاندانوں کو پاکستان میں درپیش تھی، تاہم اس کے باوجود بہت سی خواتین نے جواب شادی کر کے اپنے بچوں کے ساتھ خوش رہ رہی تھی، قسمت پر شاکر رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

کئی برس کے بعد بھی ڈھلون کی پاکستان کے دوروں کے حوالے سے تفصیلات بہت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف حقائق کو نئے زاویوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں:(9)

''میں نے چار مرتبہ پاکستان کا دورہ کیا۔ دو مرتبہ اپنے والد کے ساتھ کالج کے زمانے میں جب کرکٹ میچوں کے لئے 1950ء کی دہائی میں سرحدیں کھول دی گئی تھیں اور دو مرتبہ دوبارہ 1975ء میں اُس وقت جب بہت سے زائرین قافلوں کی صورت میں حسن ابدال میں پنجہ صاحب اور لاہور میں ڈیرہ صاحب کی زیارت کو جارہے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مجھے نہ تو تاریخیں یاد ہیں اور نہ ہی زیادہ تفصیلات خاص طور پر 1950ء کی دہائی کے دوروں کے حوالے سے تو کچھ خاص یاد نہیں ہے۔ بس مجھے یہی یاد ہے کہ ہمارا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا تھا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم نے فقیر خاندان کے گھر قیام کیا تھا جو کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیراعظم فقیر عزیز الدین کی نسل میں سے ہیں۔ بڑا بھائی ایک سینئر پولیس آفیسر تھا اور چھوٹا بھائی خوشبویات کا خاندانی کاروبار چلا رہا تھا۔ ہم سارا وقت اکٹھے ہی رہتے تھے۔ میرے والد اور فقیر خاندان والے آپس میں لطائف کا تبادلہ کرتے اور خوب لطف اندوز ہوتے۔ مجھے وہاں چلتے پھرنے میں کسی جگہ بھی محسوس نہ ہوا کہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تفریق پائی جاتی ہے۔

میں نے اور میری بیوی نے اپنے والد صاحب کی خواہش پر جون 1975ء میں لاہور میں گوردوارہ ڈیرہ صاحب کی زیارت کے لئے کئے جانے والے دورے کے دوران بھی فقیر خاندان کے لوگوں سے ملاقات کی تھی۔ اُنہیں خطوط سے اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کا دوست پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہے اور حتیٰ کہ اُسے دِل کے دورے کی تکلیف بھی ہو چکی تھی اور وہ اُس سے دوبارہ ملاقات کی تمنا رکھتے تھے۔ ہمارا ایک بار پھر اسی طرح گرمجوشی سے استقبال کیا گیا تھا اگرچہ ہم ان کے ساتھ قیام نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا جتھہ سب سے پہلے جتھوں میں سے تھا جن میں شامل سکھوں کو لاہور شہر کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی سختی سے یہ ہدایات بھی کر دی گئی تھیں کہ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گوردوارہ واپس آ جایا کریں گے۔''

فقیر گھرانے سے ملاقات کے لئے جاتے ہوئے ڈھلون نے بعض دلچسپ تجربات کا ذکر کیا، ''ٹانگہ سٹینڈ پر ہم نے انارکلی بازار کے لئے ٹانگہ لیا جو راستے میں اُسی جگہ پر پہنچ کر نیچے گر گیا جہاں سے ہم نے کچھ یادگار قسم کی اشیاء خریدنی تھیں۔ تانگے والے نے ہمیں کرایہ بتایا۔ عین اُسی وقت ایک مقامی آدمی نے جو اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا زیادہ کرایہ مانگنے پر اُس کو ڈانٹ پلا دی اور بولا نہ بھائی یہ ہمارے مہمان ہیں اور اگر تم اُن کو مُفت سیر نہیں کرا سکتے تو کم از کم زیادہ کرایہ تو نہ مانگو۔ اے قابلِ احترام سردار کرایہ۔ بنتا ہے اس سے زیادہ اسے مت دینا۔ تانگے والے نے کوئی احتجاج کئے بغیر اتنا کرایہ وصول کر لیا جتنا کہ ہم نے اسے دے دیا تھا۔ ہمیں ہر جگہ اسی طرح کے جذبات کا مظاہرہ دیکھنے میں ملا۔ اوّل تو دوکاندار خود ہی بہت دوستانہ مزاج کا مظاہرہ کرتے اور ہمیں یعنی اپنے مہمانوں کو بہت رعایت کر دیتے ورنہ کوئی اور شخص اُنہیں ڈانٹ دیتا اور ہمیں اصل قیمت سے آگاہ کر دیتا۔

بانو بازار میں جو کہ خواتین کے لئے مخصوص ہے'' سینکڑوں چھوٹی چھوٹی دوکانیں ایسی تھیں جہاں بے شمار رنگین چوڑیاں، مصنوعی، زیورات، ایسی، اور بناؤ سنگھاڑ کی بے شمار چیزیں موجود تھیں۔ ہم ابھی پہلی دوکان پر رونقوں کے جنگل میں گم تھے کہ اچانک ایک بُرقعہ پوش عورت نے جو کہ چالیس کے لگ بھگ ہوگی میری بیوی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے نقاب اُٹھا کر ''ست سری اکال'' کہا اور آواز بلند کر کے پوچھا کہ آپ پنجاب کے کس علاقے سے آئے ہیں۔ وہ یہ جان کر بہت ہی جذباتی ہوگئی کہ ہمارا تعلق امرتسر سے ہے۔ وہ کہنے لگی کہ وہ بھی امرتسر

سے ہجرت کر کے یہاں آئی ہے۔ اُس کے بعد وہ ہم سے اس شہر کے حوالے سے مختلف جہگوں اور دوسری چیزوں کا پوچھتی رہی جہاں کہ اس نے جنم لیا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ وہ حسین پورہ میں رہتے تھے اور یہ کہ اس کے والد صاحب ایک معروف وکیل تھے۔ اُن کی رہائش ماجیتھا کی طرف جانے والی بڑی سی سڑک پر واقع ستونوں والے مکان میں تھی۔ اس کی باتوں سے میں نے فوراً ہی اندازہ لگالیا کہ وہ کونسے مکان کی بات کر رہی تھی کیونکہ ہمارا ایک قریبی خاندانی دوست مسٹر سجن سنگھ مرگند پورا، ایم ایل اے اس مکان میں رہتا رہا تھا اور ہم خود بھی اس مکان میں کچھ عرصہ کے لئے ان دنوں رہتے رہے تھے جب 1955ء کی طوفانی بارشوں کے دوران ہمارے گولڈن ٹمپل کے قریب واقع مکان میں کچھ دراڑیں پڑ گئی تھیں وہ بہت ہی جذباتی ہوگئی تھی اور جاتے ہوئے خدا حافظ کہنے سے قبل دکاندار کو یہ کہہ کر سو روپے تھما گئی کہ میری بیوی کو جو چیز پسند آئے وہ دے دینا میرے اس احتجاج کے باوجود کہ امرتسر سے تعلق کی بناء پر وہ میرے لئے بہن کی طرح تھی اور بھائی اپنی بہنوں سے تحفے نہیں لیتے۔ یہ میری بھابھی کے لئے ہیں بھاء جی اور ہمیں حیران پریشان چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔

بانو بازار سے ہم مال روڈ چلے گئے جہاں جونیئر فقیر برادر کی ٹائروں کی ایجنسی تھی۔ جون کا سورج کھلی اور چوڑی مال روڈ پر پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ ہم نے راستہ پوچھنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہم حبیب بنک کی ایک برانچ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ بنک کا ایک باوردی گارڈ کندھوں پر بندوق لٹکانے کوکا کولا کی خالی بوتلوں کی ٹوکری ہاتھ میں پکڑے باہر آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب سے گزرا تو ہمیں دیکھ کر سلام کیا، ہم نے راستہ پوچھا۔ اُس نے کہا کہ وہ سڑک کے کنارے کھوکھے والے کو بوتلیں واپس کر کے ابھی ہمارے ساتھ آتا ہے۔ وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں کوکا کولا کی دو تازہ کھلی ہوئی بوتلیں تھیں جو اُس نے سورج اور ہمارے چہرے پر نظر آتے ہوئے پسینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں تھما دیں اور اصرار کر کے کہا کہ ہم یہ بوتلیں پی کر اُس کی عزت افزائی کریں اور اس کے ساتھ ہی ہمیں راستہ بھی بتا دیا۔ جب میں نے احتجاج کیا تو وہ کہنے لگا کہ اُس پر سکھوں کے بے شمار احسانات ہیں اور اُسے سمجھ نہیں آتا کہ وہ ان کا بدلہ کیسے اُتارے۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ وہ فوج میں تھا اور بنگلہ دیش میں شکست کے بعد انڈیا کے ہاتھوں جنگی قیدی بننے والے والے 90,000 فوجیوں میں شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ سکھ افسروں

اور سپاہی اس کے ساتھ بہت ہی نرم رویہ رکھتے تھے اور اب اُسے پہلا موقع ملا ہے کہ وہ ان کے ساتھ جوابی طور پر کچھ شفقت کا مظاہرہ کرے۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایسی دوکان پر پہنچ گئے جہاں ایک روایتی پنجابی پہلوان براجمان تھا۔ اور جس وقت دکاندار ہمیں ٹرانسٹر ریڈیو دِکھا رہا تھا تو اُس نے ہمیں سلام کرتے ہوئے پوچھا: ''سردار جی آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے اُسے بتایا کہ ہم امرتسر سے آئے ہیں۔ امرتسر شہر یا کسی خاص دیہات سے؟ وہ جاننا چاہتا تھا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اُسے بتایا کہ اصل میں ہمارا تعلق ترن تارن تحصیل میں واقع گاؤں جھوبال سے ہے، اور اب ہماری زمینیں اجنالا کے قریب ایک گاؤں میں ہیں۔ وہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور ہمیں بتانے لگا کہ ان لوگوں کا تعلق بھی سرحد کے قریب کسی دیہات سے ہے۔ اُس نے چند ایک لوگوں کا نام لیا اور جن کو وہ جانتا تھا اور یہ کہ میں بھی ان کو ضرور جانتا ہوں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُس گاؤں میں کچھ لوگوں جانتا ہوں مگر جن لوگوں کا اس نے نام لیا ہے ان سے واقف نہیں ہوں۔ اُس کے پہلوانی انداز واطوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے اُسے ہنستے ہوئے کہا کہ اس طرح کا انداز واطوار ضلع امرتسر کے سرحدی گاؤں میں بھی بہت عام ہے۔ وہ فوراً ہی میری بات کی تہہ میں پہنچ گیا اور کہنے لگا کہ اس طرح کے انداز واطوار کے ساتھ سرحد پار کرنا بہت ہی آسان ہے۔ ہلکی پھلکی خوشگوار گفتگو کے علاوہ ہم نے چائے اور اس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت اُلو کی شکل کا ٹرانسٹر جس کی قیمت 150 روپے کے لگ بھگ ہوگئی بالکل مُفت حاصل کیا، ''ایک پاکستانی دوست کی طرف سے تحفے کے طور پر۔''

تقسیم کے حوالے سے ڈھلون کی یادیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسانی تکلیفوں نے انسانیت کو ایک بہت بڑی آزمائش سے دوچار کر دیا تھا اور اگرچہ اس کی بناء پر بعض لوگوں کے اندر جہاں حیوانی خصلت اُبھر آئی تھی وہاں اس نے دوسرے لوگوں کے اندر ایک ہمدرد اور انسان دوست جذبے کو بھی اُجاگر کر دیا تھا۔

## کٹھپالیا خاندان: ایک سچے نواب کے ہاتھوں بچاؤ

اندرا کھٹپالیا جو کہ اب نئی دھلی میں سکونت پذیر ہے اب 70 برس سے اوپر کی ہو چکی ہے اگرچہ اس نے اپنی ابتدائی تعلیم سیکرڈ ہارٹ کانونٹ اسکول لاہور سے حاصل کی تھی مگر اس کے

ددھیال والے ڈیرہ نواب صاحب اورننھیال والے بہاولپور میں سکونت پذیر تھے جو کہ پندرہ لاکھ کی آبادی پر مُشتمل مسلم اکثریتی ریاست ہے۔اُس کی کہانی کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو کہ اُس دور کی مروجہ صلح جو روایات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ اس کے والد کو نواب آف بہاولپور نے وہاں سے فرار ہونے میں مدد فراہم کی۔دوسری یہ کہ جب فسادات پھوٹ پڑے تو وہ اور اس کی بہن ڈیرہ نواب صاحب میں اکیلے رہ گئے تھے، جبکہ ان کے والد صاحب دھلی گئے ہوئے تھے۔ اس عرصے میں انکی نگہبانی ودیکھ بھال کے فرائض مسلمان ملازموں کے علاوہ ایک شریف النفس انسان کرنل قادر نے سرانجام دیئے۔تیسرے یہ کہ اگرچہ اس کے نانا جان کو تقسیم کے دوران قتل کر دیا گیا تھا مگر مسلمان لڑکوں نے باقی سارے خاندان کو بحفاظت مہاجر کیمپ پہنچا دیا تھا۔

قبل از تقسیم دور کے سماجی ڈھانچے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اُس نے کہا کہ تمام مذاہب کے لوگ مل جُل کر پُرسکون زندگی گزار رہے تھے اگرچہ ہندو اور مسلمان کھانا اکٹھے نہیں کھاتے تھے۔تاہم ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کیا جاتا تھا۔مثال کے طور پر غیر مسلم حلال گوشت نہیں کھاتے تھے اس لئے ہندوؤں کے تہواروں پر مسلمان ان کے گھروں میں حلال طریقے سے تیار کی ہوئی چیزیں نہیں بھجواتے تھے۔ایک اور دلچسپ نکتہ جو گفتگو کے دوران سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس کے گھر کی دوسری خواتین ''برقع'' پہنتی تھیں کیونکہ یہ غیر مردوں کے سامنے اپنے چہروں کو چھپائے رکھنے کا ایک طریقہ تھا۔مطلب یہ کہ بُرقع ایک ثقافتی اور سماجی نشان بھی تھا نہ کہ صرف مذہبی علامت جیسا کہ بہت سے علمائے گرام کا خیال ہے۔(10)اس کے علاوہ بہت سے مواقع پر مسلمان دوست احباب ان کے گھر آتے اور ''نماز'' ادا کرتے ..... حقیقت میں اندرا کٹھپالیا کی بہن اوناہری ماتھ کے پاس ابھی تک وہ جاءنماز موجود ہے جو ان کی دوست وغیرہ ان کے گھر میں آکر نماز پڑھتے وقت استعمال کرتی تھیں۔

فسادات کی یلغار کے آغاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اندرا کٹھپالیا نے بتایا کہ اس کے نانا جان مہتاب فتح چند تیجا نے بتایا کہ اس کے نانا جان مہتاب فتح چاند تیجا جو کہ بہاولپور میں سکونت پذیر تھے، اپنا گھر چھوڑ کر چلے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔حقیقت میں فسادات شروع ہونے سے چند روز قبل ہی اُنہوں نے اپنے کاروبار سے حاصل ہونے والی منافع کی رقم

سے زمین خریدی تھی۔ اُنہوں نے یہ کام اس لئے کیا تھا تا کہ پتہ چل جائے کہ وہ بہاولپور میں ہی قیام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چند روز بعد کوئی جولائی کے اواخر کے لگ بھگ اُنہیں گولی ماردی گئی۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ یہ مسلمان لڑکے ہی تھے جوان کی لاٹھی اُٹھا کر گھر لے آئے اور باقی خاندان والوں کو بھی فرار ہو کر مہاجر کیمپ پہنچانے میں مدد کی۔

مزید آگے چل کر، تقسیم کے حوالے سے اپنے ذاتی تجربات پر گفتگو کے دوران اندرا کھٹپالیا نے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ جون کے مہینے کے قریب نواب صاحب لندن روانہ ہو گئے جبکہ اُس کے والد صاحب جو کہ کراچی تک اُن کے ساتھ گئے تھے آگے دھلی چلے گئے۔ اور اگر چہ اس وقت تک فسادات مزید بڑھ چکے تھے تاہم ان کے مسلمان مرد ملازم اور ایک اور شریف النفس انسان کرنل قادران کی دیکھ بھال اور نگرانی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

وہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتی ہے جس سے یہ حقیقت بڑے جامع انداز میں عیاں ہوتی ہے کہ اس زمانے میں خواتین کی عصمت کا تصوّر کس قدر اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی والدہ نے کرنل قادر کو بتایا کہ اگر اُسے کچھ ہو جاتا ہے تو وہ لڑکیوں کو گولی مارنے میں ذرّہ بھر بھی تامل نہ کرے۔ موخرُ الذکر نے جواب دیا کہ اگر چہ وہ اس طرح کا قدم اُٹھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، تاہم وہ لڑکیوں کو سکھا دے گا کہ وہ ایسی صورتحال میں خود کو کس طرح گولی مار سکتی ہیں اور لڑکیوں کو گولی مارنے کا فن سکھانے کے دوران ایک مرتبہ گولی اس کی بہن کے کان کے بہت ہی قریب سے گزرتی ہوئی سیدھی ہوا میں چلی گئی اور اُلٹا اس کے والد صاحب کے کتب خانے کو نقصان پہنچانے کا سبب بن گئی۔ اس نے ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر بھی کیا۔ اُس کے دادا جان کی وفات کے بعد کچھ لوگ اِکٹھے ہو کر افسوس کرنے آئے۔ یہ لوگ ہندو تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اس کی ماں جو ویسے ایک غیر متعصب خاتون تھی ان کو مخاطب کر کے کہنے لگیں، ''مذہب کوئی قمیض نہیں ہوتی کہ جب دِل چاہا بدل لی۔''

انہوں نے اسلام قبول کر لینے کی ایک اور منفرد مثال بھی دی کیونکہ اُس نے اسلام اور پاکستان کی حمایت میں بعض مشکوک نومسلموں کی طرف سے چلائی جانے والی ایک ''کمزور'' سی تحریک کا بذاتِ خُود مشاہدہ کیا تھا۔ بقول مون: (11)

''.....جب ہندوؤں کو ہماری تسلیوں اور یقین دہانیوں کے بعد اچھی طرح اِطمینان

ہوگیا کہ ہم اُنہیں کسی طرح کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے تو اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ اُن کا تعلق نہر کی دوسری جانب واقع بڑے سے دیہات سے ہے اور یہ کہ گذشتہ روز اِردگرد کے علاقوں سے مسلمانوں کے بڑے بڑے جتھوں نے ان کے گاؤں میں غارت گری اور لوٹ مار کی وارداتیں کی تھیں اور یہ کہ اُنہیں اپنی جان بچانے کے لئے اسلام قبول کرنا پڑا تھا۔''

اندرا کٹھیالیا کے والد صاحب اگست کے اواخر میں بہاولپور واپس آ گئے تھے جبکہ فسادات ابھی شروع ہوئے تھے، اور ان کے خاندان کو نواب صاحب کی سرپرستی میں تحفظ ملتا رہا جو کہ لندن سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے دھلی جا کر ریاست کے مُستقبل کا فیصلہ کرنے کی دعوت ملنے کے بعد جولائی میں بہاولپور واپس آ گئے تھے۔ لگ بھگ نومبر کے مہینے میں نواب صاحب نے آخرکار ان کے خاندان کو آگاہ کیا کہ بہتر ہوگا کہ ابھی آپ چلے جائیں اور کچھ عرصے بعد جب حالات درست ہو جائیں تو پھر بے شک واپس آ جائیں۔

اُنہوں نے نیو دہلی میں بہاولپور ہاؤس میں ان کے قیام کا بندوبست کر دیا تھا۔ اتفاق سے امریکن سنٹر لائبریری کافی عرصہ تک بہاولپور ہاؤس میں کام کرتے رہنے کے بعد کستور باگاندھی مرگ مُنتقل ہوگئی تھی۔ جب آئی کے گجرال وزیراعظم بنے تو ان سے درخواست کی گئی تھی کہ اس اثاثے کو بہاولپور ویلفیئر ایسوسی ایشن کے نام کر دیا جائے۔(12)

واپس اس قصے کی طرف لوٹتے ہوئے کہ وہ وہاں سے کس طرح فرار ہوئے تھے، بتایا گیا کہ نواب نے ان کے خاندان کو اپنی ذاتی ٹرین میں روانہ کیا تھا۔ وہ سب سے پہلے راجستھان میں ہندو مالکوٹ پہنچے تھے، جو انڈیا کا سب سے پہلا ریلوے اسٹیشن تھا۔ وہاں سے وہ لوگ دِلی روانہ ہوگئے۔

حتیٰ کہ تقسیم کے بعد بھی اندرا کھٹپالیا کے خاندان نے بہاولپور میں اپنے دوستوں، خاص طور پر نواب صاحب سے روابط جاری رکھے۔ نواب صاحب نے بعدازاں مولانا آزاد کو ایک خط بھی لکھا تھا جس میں اس کے والد کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگرچہ اس کے نانا جان کو مسلمانوں نے ہلاک کیا تھا مگر اُس کی والدہ نے کبھی بھی ان کے خلاف اپنے دِل میں کوئی رنجش نہیں رکھی۔ مسز کٹھپالیا کو بہاولپور میں اپنے گھر کا دوبارہ کبھی دورہ کرنے کا موقع نہیں ملا حالانکہ وہ 2000 میں لاہور اور اسلام آباد آ چکی ہے۔

**کوہلی گھرانہ: جسے ایک مسلمان امام اور ولی نے بچایا تھا۔**

77 سالہ جوگندر سنگھ کوہلی کا تعلق جو کہ اب امرتسر میں سکونت پذیر ہے، اُسی گاؤں سے ہے جو کہ انڈیا کے وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ کا آبائی گاؤں بھی ہے۔ بلکہ حقیقت میں وہ اس مقامی پرائمری اسکول میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے رہے ہیں جسے اب ڈاکٹر سنگھ کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اُسے یاد ہے کہ اوّل الذکر ایک بہترین طالب علم تھا۔ مارچ 1947ء میں ہونے والے فسادات کے دوران کوہلی خاندان کو بہت سے مسلمانوں بشمول گاؤں کے ایک مولوی اور مسلمان ولی نے بچالیا تھا۔

جے ایس کوہلی اپنے اس گاؤں کا تذکرہ بڑے شوق سے کرتا ہے جہاں سکھوں اور مسلمانوں کا میل جول شہرت رکھتا تھا۔ دونوں فرقوں کے تعلقات اتنے مثالی تھے کہ حتیٰ کہ گاہ میں فسادات چھڑ جانے کے بعد بھی مسلمان کبھی گردوارہ میں سکھوں پر حملے کی نیت سے داخل نہیں ہوئے۔ وہ یہ نکتہ بھی عیاں کرتا ہے کہ تقسیم سے پہلے کے دنوں میں مسلمان بڑے جوش وخروش سے غیر مسلموں کی شادی میں نہ صرف شرکت کرتے تھے۔ بلکہ ان کی ہر ممکن مدد بھی کرتے تھے۔ وہ ایک اور اہم نکتہ بھی اُجاگر کرتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے علاقے میں مسلمان اس کے خاندان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

تقسیم کے دوران اپنے خاندانی تجربات کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کوہلی نے جسکی یادداشت منظر کشی کی بہت اچھی صلاحیت رکھتی ہے، بتایا کہ ''فسادات مارچ 1947ء کے لگ بھگ شروع ہوئے تھے اور میں ان دنوں لاہور میں کام کر رہا تھا۔ تاہم میرے باپو مرحوم اوتار سنگھ کوہلی ہمیں بتایا کرتے تھے کہ کوئی 14 مارچ 1947ء کے قریب قریب کی بات ہے جب لوٹ مار اور فسادات کا آغاز ہو چکا تھا''۔ ان کی ہمسائی فاطمہ نے انہیں خبردار کرتے ہوئے کہا تھا ''بھائی اوتار لوٹ مار اور دنگا فساد شروع ہو چکا ہے، آپ یہاں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ میرے والد نے فوری ردِعمل کے طور پر کوڑے کے اس ڈرم میں چھلانگ لگا دی جو مقامی بدرو کے ساتھ پڑا تھا۔''

بلوائی اُنہیں نہ پہچان سکے کیونکہ اُنہوں نے مسلمانوں والے کپڑے پہن رکھے تھے اور اُسی زمانے میں پگڑی یا صافہ صرف سکھ نہیں پہنا کرتے تھے۔ اُنہوں نے صرف اپنے چہرے کو

چھپا لیا تھا کیونکہ لوگ اُنہیں ان کی داڑھی سے پہچان سکتے تھے۔ کوہلی کسی طرح فرار ہو کر گاؤں کرسال پہنچ گیا جہاں ان کا کوئی خاندانی دوست، پیر ولایت شاہ نامی، مقامی بزرگ رہائش پذیر تھا۔ موخرالذکر نے اس کے والد کو ایک گھوڑا اور دو آدمی فراہم کئے تا کہ وہ چکوال میں قائم مہاجر کیمپ پہنچ سکے۔

اس دوران جوگندر کا چھوٹا بھائی، ماں، اور بہنیں ابھی گاؤں میں ہی تھے اور گاؤں کے نوجوان مسلمانوں نے بعض مخصوص گھروں پر جن میں خواتین موجود تھیں، نشانات لگا دیئے تھے۔ اُن کا پروگرام یہ تھا کہ ان خواتین کو زبردستی مسلمان کرنے کے بعد ان سے شادی کر لیں گے۔ گاؤں کے مولوی صاحب جن کا نام غلام نبی تھا، اوتار سنگھ کے قریبی دوست تھے اور اُنہوں نے ایک حکمتِ عملی کے تحت کچھ وقت کی مہلت حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اُنہوں نے ان نوجوانوں سے کہا کہ وہ ان تمام عورتوں کو مسلمان بنانے سے پہلے شادی نہیں کر سکتے اور اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ حرام (غیر شرعی) ہوگا۔ اس کے بعد مولوی صاحب اُنہیں مسجد لے گئے جہاں اُنہوں نے رات بھر قیام کیا۔ اس عرصے کے دوران اوتار سنگھ کے ایک اور دوست فتح محمد نے جس کی بیوی اوتار کی بہن بنی ہوئی تھی، خواتین کے لئے کھانے کا بندوبست کیا، جبکہ فتح محمد نے ہر ایک کو یقین دہانی کرائی کہ وہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دے گا۔

کوہلی نے بعض بہت دلچسپ قسم کے مشاہدات پیش کئے۔ پہلی بات تو یہ کہ بہت سے بلوائیوں کا تعلق دوسرے قصبوں یا دیہاتوں سے تھا، اور ان میں مقامی بہت کم تھے۔ دوسرے یہ کہ جہاں فسادات جاری تھے ان میں گاؤں کا کوئی بھی بڑا شریک نہیں تھا۔ تیسرے یہ کہ بہت سے افراد کے نزدیک فسادات مذہبی مخاصمت یا اختلاف کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ماضی کی رنجشوں اور اقتصادی طور پر بدتر حالات کا نتیجہ تھا۔ مثال کے طور پر اُس کے والد کی گاؤں کے ایک مسلمان نمبردار سے دُشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار جی ڈی کھوسلہ نے بھی کیا ہے جس کی مطابق:

''یہ کوئی مذہبی جذبات یا جارحانہ قسم کی قوم پرستی کے عوامل نہیں تھے جو کہ ہندو اور سکھ اقلیتوں پر حملوں کا سبب بنے، مگر ذاتی مفاد حاصل ہونے کے امکانات تھے۔ یہ بات دوسرے ضلع کے لوگوں کی نسبت سب سے زیادہ جہلم کے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ (13)

اگلے روز تک اوتار سنگھ چکوال کے ماہر کیمپ تک پہنچ چکا تھا اور وہاں سے واپسی پر اپنے

ساتھ ایک فوجی جیپ لیتا آیا تا کہ اپنے اہل خانہ کو بحفاظت وہاں سے نکال لے جائے۔ اپنے گاؤں کے دوستوں کو رقت آمیز انداز میں خدا حافظ کہنے کے بعد وہ لوگ لاہور روانہ ہو گئے۔ کوہلی کی کہانی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کیونکہ مارچ 1947ء میں فسادات کی پہلی لہر کے اختتام پر بھی جب حالات کچھ حد تک پُر امن ہو گئے تو اس وقت وہ لاہور میں خود کو محفوظ تصوّر کر رہے تھے۔

آخر کار اگست 1947ء میں وہ جلو سے چہار ٹہ کے راستے امرتسر مُنتقل ہو گئے۔ انہیں امرتسر پہنچنے میں تقریباً دس دن لگ گئے تھے۔

جوگندر سنگھ کوہلی نے تقسیم کے بعد بھی پاکستان میں اپنے روابط اُستوار رکھے۔ اُس نے فتح محمد کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنے کے ساتھ ہی سرحد پار اپنے کاروبار کی بدولت نئی دوستیاں بھی بنالی تھیں۔ حقیقت میں بقول اُس کے:

''تقسیم کے بعد کچھ عرصہ تک آنا جانا بہت آسان رہا اور 1950ء سے لے کر 1965ء کے درمیان میں نے کئی مرتبہ پاکستان کا دورہ کیا۔''

کوہلی کا ویزہ اُسے پاکستان کا سال میں 8 مرتبہ دورہ کرنے کی سہولت فراہم کرتا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ 2 ماہ تک مسلسل قیام کر سکتا تھا۔ اُسے یہ بھی یاد ہے کہ انڈیا اور مشرق وسطیٰ کے مابین تجارت کا حجم بہت زیادہ تھا، کیونکہ یہ تجارت زیادہ تر پاکستان کے زمینی راستے سے ہوتی تھی۔ دراصل کوہلی 1965ء کی جنگ کے موقع پر بھی پاکستان میں موجود تھا۔ اسے بعض پاکستانیوں کے وہ الفاظ یاد ہیں کہ یہ پاکستان میں قیام کا مناسب وقت نہیں ہے کیونکہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑنے والی تھی۔

پاکستان کے بعض دوروں کی یاد اس کے ذہن میں بہت گہرا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ 1966ء میں وہ ایک تاریخی واقعے کی تقریبات میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ 1978ء میں وہ ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لئے آیا تھا اور پھر 1980ء میں وہ پنجہ صاحب کی زیارت کے سلسلے میں آیا۔ وہ لوگوں کے ایک بہت بڑے گروپ کے ساتھ آیا تھا، اور اس کے والد کا دوست فتح محمد اور اس کا سارا خاندان بھی وہاں اُس سے ملنے پہنچ گیا تھا۔ 1980ء کے بعد اُسے پاکستان کا دورہ کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا، اگرچہ پاکستان سے اُس کے دوست اُسے ملنے انڈیا آتے رہتے ہیں۔

چنانچہ کوہلی کے لہجے میں کسی قسم کی کوئی تلخی نہیں ہے اور ایک کاروباری فرد کے طور پر وہ پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات اور سرحدوں کی پابندیاں نرم کرنے کے حق میں ہے۔ کوہلی کے خیال میں تعلقات کی بہتری سے انڈیا اور پاکستان کو عمومی اور دونوں پنجابوں کو خصوصی فائدہ ہوگا۔

## لدّھے والا وڑائچ: مذہب اور جغرافیہ کی پابندیوں سے بے خوف

78 برس کی عمر میں مسٹر مالو یندر جیت سنگھ وڑائچ بہت ہی کثیر جہتی شخصیت ہے۔ ایک مورخ، انسانی علوم کا ریٹائرڈ پروفیسر، پیشہ ور وکیل، اور اس کے ساتھ ہی بہت دلچسپ اور مسحور کن صاحبِ گفت گو بھی۔ تقسیم کے دوران اسے جن تجربات کا سامنا کرنا پڑا وہ بہت سے مورخین اور ماہرین سماجی علوم کے لئے ایک انکشاف کی مانند ہوں گے، تاہم اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس کے گاؤں لدّھے والا وڑائچ کی قبل از تقسیم دور کی کہانی ہے جو گاؤں کی مخلوط و ہم آہنگ روایات اور پنجاب میں مختلف قبائل خصوصاً جاٹ لوگوں کے درمیان مضبوط نسلی بدھنوں کی بہت ہی موثر انداز میں عکاسی کرتی ہے۔ یہ گاؤں مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل تھا اور یہاں 80 فی صد مسلمان جبکہ 20 فیصد غیر مسلم آباد تھے۔

گاؤں میں مسلمانوں کی 80 فیصد آبادی کے باوجود وڑائچ کے والد صاحب صوبیدار بھاگ سنگھ ایک عشرے سے زیادہ عرصے تک اس گاؤں کے سرپنچ رہے اور اپنی پاکیزہ صفت شخصیت، انسانی ہمدردی اور برداشت وغیرہ کی خصوصیات کی بناء پر ہر ایک ان کی عزّت کرتا تھا۔

اگرچہ کچھ حد تک مذہبی تفریقات موجود تھیں مگر ہندوؤں کی مناجات بعض اوقات درگاہوں میں پڑھی جاتی تھیں اور درحقیقت ملویندر کو یاد ہے کہ ایک گرمیوں کی شام مسلمان اور غیر مسلم شخصیات مل کر سدّھو کا وعظ سُننے آئے تھے۔ وڑائچ کے برادرِ نسبتی مرحوم جوگندر سنگھ چیمہ اور ایک اور رشتہ دار مرحوم پریتم سنگھ بھنڈر کے درمیان خصوصی تعلق پایا جاتا تھا۔ وہ لوگ ظہور اِلٰہی (چوہدری شجاعت حسین کے والد صاحب) کے بہت قریب تھے جو کہ گوجرانوالہ میں کانسٹیبل کے عہدے پر مامور تھے۔ وڑائچ کی بہن کی شادی پر اصل میں ظہور الٰہی کو لڑکے (جوگندر سنگھ چیمہ) کی طرف سے بلایا گیا تھا، مگر جب ان کے علم میں آیا کہ لڑکی والے وڑائچ میں تو ان کے مُنہ سے برجستہ نکلا کہ ''میں لڑکے کی جانب سے کیسے ہوسکتا ہوں جبکہ لڑکی میری بہن ہے۔''

اس ایک واقعے سے ہی اس امر کی بہت خوبصورتی سے عکاسی ہو جاتی ہے کہ برادری اور ذات پات کے بندھن کس طرح مذہب اور سماجی درجوں سے ماورا حیثیت رکھتے تھے۔ دوستی اصل میں اس وقت پروان چڑھی جب بھنڈر اور چیمہ دونوں کو ایک مقامی رُکن اسمبلی کے رشتے دار کے قتل کے غلط الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ظہور الٰہی نے انہیں اپنے گھر میں قیام کروایا تا کہ کوئی انہیں پریشان نہ کر سکے۔ اُنہوں نے ایک برطانوی افسر کو قائل کر کے کہ ان پر غلط الزامات عائد کیے گئے ہیں انہیں رہائی بھی دلوادی۔ ان کے گھر میں قیام کے دوران ظہور الٰہی نے اس امر کو یقینی بنایا کہ انہیں کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ ہو اور حتیٰ کہ ان کے آرام کا اتنا خیال رکھا کہ انہیں وہ رضائیاں تک فراہم کر دیں جو انہیں جہیز میں ملی تھیں۔

اسی طرح گاؤں کے متنوع مگر رواداری پر مبنی سماجی ڈھانچے کی ایک اور دِلکش عکاسی اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ وڑائچ خاندان کے ایک فرد نے کسی مسلمان سے شادی کر لی اور ایک لڑکے کو جنم دیا جس کو بعد ازاں چوہدری محمد علی کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ اس کی وفات کے بعد اُنہوں نے اسلامی روایات کی پیروی شروع کر دی۔ چوہدری محمد علی کا ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی انتقال ہوا ہے اور ان کا خاندان ابھی تک وڑائچ خاندان سے رابطے میں ہے۔

تاہم لدّھے والا کے وڑائچ کی پُر امن روایات دیرپا ثابت نہیں ہوئیں۔ اگست 1947ء میں برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد فسادات شروع ہو گئے۔ حالات کی ستم ظریفی سے جب پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا تو اس دیہات میں کافی دنوں تک امن قائم رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وڑائچ کے والد صاحب نے پاکستان کا جھنڈا ابھی لہرایا۔ ایک غیر مسلم کی جانب سے پاکستانی جھنڈے کو لہرانے کا واقعہ بہت دلچسپ کا حامل ہے۔ اسی طرح سرگودھا کی تحصیل فاروق آباد کی ایک کاروباری شخصیت پرتاپ سنگھ بجاج نے بھی کیا۔ اپنے ہم عمر بہت سے دیگر افراد کی طرح وڑائچ کو یقین تھا کہ اگر پاکستان بن بھی گیا تو وہ پھر بھی وہاں سے نہیں ہلیں گے۔ زیادہ سے زیادہ وہ چند ماہ کے لئے کہیں چلے جائیں گے اور پھر واپس آ جائیں گے۔ اس طرح کے خیالات اس زمانے میں عام تھے جن کی بہترین عکاسی پرکاش ٹنڈن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے ''ہم ہندو اور سکھ اس سے قبل مسلمان حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہے ہیں، پھر سکھوں اور برطانویوں کی رعیت میں بھی اور اگر اب پھر سے مسلمانوں کی حکومت آ جائے گی تو کیا ہوا؟ ہم پہلے بھی اکٹھے رہتے رہے

اوراب بھی رہ لیں گے۔آج کل کی حکومتیں ذرامختلف ہیں، وہ لوگوں کوحقوق دیتی ہیں اوران کی بات بھی سُنتی ہیں۔''(14)

تاہم، آہستہ آہستہ حالات بگڑتے چلے گئے اوران کے خاندان کومجبور ہوکر وہاں سے چلے جانا پڑا کیونکہ فسادات پھیل کر پاکستان میں راولپنڈی اور سرحد کے اس پار امرتسر تک جا پہنچے تھے۔ 23 اگست 1947ء کو وڑائچ کے والد بھاگ سنگھ کو دیہات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے وسیع پیمانے پر قتل عام کے منصوبے کی روک تھام کیلئے دیہات کے مسلمانوں سے مذاکرات کرنے پڑے۔اُنہوں نے اپنا اسلحہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور یوں اپنے خاندان کی با حفاظت مُنتقل کا ایک اہم وسیلہ بھی اپنے ہاتھ سے دوسروں کے سپرد کر دیا۔ اب وڑائچ اور اس کے خاندان کو احساس ہو چکا تھا کہ انہیں وہاں سے جانا پڑے گا کیونکہ حالات خراب سے خراب تر ہو رہے تھے۔ وڑائچ اوران کے خاندان والوں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پہلا تو یہ تھا کہ گوجرانوالہ کیمپ چلے جائیں جو کہ کچھ میل کے فاصلے پر تھا مگر سفر خطرات سے پُر تھا۔ دوسرا یہ کہ سچا سودا چلے جائیں جو اگرچہ 20 میل کی مسافت پر تھا مگر نسبتاً محفوظ تھا۔ لہٰذا ء دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا، اگرچہ راستہ نامانوس سا تھا۔

وڑائچ کے مطابق 25 اگست 1947ء کو نقشہ کچھ اس طرح سے تھا:

''ہم سب گاؤں کے کھیل کے میدان میں جمع ہونا شروع ہو گئے، جہاں سے کہ راستہ ہمارے قدموں کا بوجھ برداشت کر سکتا تھا، ہم میں سے ہر ایک بہت بھاری بھرکم تھا۔ ہمارے بہت سے مسلمان ہمسائے ہمیں یہاں خدا حافظ کہنے کے لئے جمع ہو چکے تھے، اپنے برابر والوں کو گلے لگاتے ہوئے، چھوٹوں کو تھپکی دیتے ہوئے، اور بڑوں کو احترام سے جھک کر سلام کرتے ہوئے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میرا ایک دوست جو کہ پاکستان کا بہت کٹر حامی تھا کس طرح میرے بڑے بھائی کے کندھے کو مضبوطی سے دبائے زور زور سے گریہ وزاری کر رہا تھا۔''

وڑائچ خاندان نے گاؤں کے بہت سے دیگر افراد کے ہمراہ آخر کار اپنی منزل سچا سودا کی طرف قدم بڑھا دیئے جو کہ لدّھے والا سے 20 میل کی مسافت پر تھا۔

مہاجرین نے ہاتھوں میں تلواریں اور بانس کی سوٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے ہی دو تین میل آگے بڑھ کر قلعہ میہان سنگھ نامی دیہات کے قریب پہنچے تو قافلے پر فائرنگ شروع

کردی گئی۔ مہاجرین اور حملہ آوروں کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پا گیا اور اس کے تحت اول الذکر نے اپنے ہتھیاران کے حوالے کرنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ موخرالذکر فریق اپنی زبان سے پھر گیا اور ہجوم کو دوبارہ حملے پر اُکسانے لگا۔ قلعہ میہان سنگھ پہنچ کر ملویندر اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے ایک الگ راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مرحلے پر ایک نوجوان مسلمان قصاب نے ملویندر اور اس کے بھائی دونوں کو پناہ دینے کی پیشکش کی۔ تاہم اُنہوں نے مزید انتظار نہ کیا اور اپنی اپنی منزلوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ ملویندر کھبیکے نامی ایک گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا وہاں ایک بزرگ نے وڑائچ کو پناہ دے دی۔ بعدازاں اُسے دن کے وقت قلعہ میہان سنگھ میں ہونے والی ہلاکتوں کی خبر ہوئی۔ وہاں پہنچ کر اُسے اسی شام پتہ چلا کہ اُس کے والد اور سب سے چھوٹے بھائی کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ اس مرحلے پر حملہ آوروں کے اسی گروہ نے جنہوں نے لدّھے والا وڑائچ کے مہاجرین پر گولی چلائی تھی اب اُنہیں پناہ یا تحفظ دینے کا ارادہ یا آمادگی ظاہر کر دی اس اعتراف کے ساتھ کہ پہلے اُنہوں نے اس مغالطے گولی چلائی تھی کہ مہاجرین ان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

کچھ دن قلعہ میہان سنگھ میں قیام کے بعد وڑائچ اور دیگر دیہاتیوں نے فیصلہ کیا کہ گوجرانوالہ میں قائم مہاجر کیمپ کا رُخ کیا جائے۔ بقول وڑائچ: ''ہم نے چند روز قلعہ میہان سنگھ میں قیام کیا۔ کچھ دنوں کے بعد گوجرانوالہ مہاجر کیمپ میں ٹھہرے ہوئے ہمارے رشتہ داروں نے ایک فوجی گاڑی پر حفاظتی دستہ روانہ کیا تاکہ وہ ہمیں بحفاظت وہاں پہنچا دیں۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ کیمپ میری مادر علمی یعنی خالصہ ہائی اسکول میں واقع تھا۔''

اس کیمپ پر کشمیری کمیونٹی نے ہر ایک کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ جس کسی نے ایک سکھ کو بھی ہاتھ لگایا اُسے خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وڑائچ نے ایک غیر معمولی نکتہ عیاں کیا جو عموماً کسی ایسے فرد کی نفسیات سے مطابقت نہیں رکھتا جو خود کسی تکلیف دہ صورتحال سے گزرا ہو:

''انڈیا پہنچنے کے بعد، تقسیم کے تمام تر مصائب اور دُکھ برداشت کر چکنے اور اس غیر یقینی صورتحال کے باوجود کہ ہم اب خاندان کی کفالت کے لئے کیا کام کریں گے، میرے خاندان والوں، خصوصاً میری والدہ نے ان مسلمان قافلوں کے ساتھ بہت ہمدردانہ سلوک کا مظاہرہ کیا جو

پاکستان فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتیں کہ وہ ان کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور وہ بحفاظت سرحد پار اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔''

ستیش گجرال نے ماضی میں جھانک کر درج ذیل یادداشتیں پیش کیں:

''تقسیم کے تلخ دور کا ایک تسکین دہ پہلو وہ طریقہ تھا جو مہاجرین کے بعض قافلوں کی تشکیل کرنے والے بدنصیبوں کی طرف سے ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہونے پر سمجھانے یا سبق سکھانے کے لئے اختیار کیا گیا۔ اگرچہ اس طرح کی بھی مثالیں موجود ہیں جن میں مخالف قافلوں کا آمنا سامنا دراصل قتل وغارت گری کی شکل اختیار کر گیا، مگر اس سے زیادہ یہ مثالیں دیکھنے میں آئیں جہاں دونوں مقابل فریق ایک دوسرے کی یکساں قسمت یا مقدر پر اظہار ہمدردیاں کرتے دکھائی دیئے۔ دونوں ایک دوسرے کو پینے کا پانی اور دیگر ضروری اشیاء بھی فراہم کرنے کا مگر اس سے بھی اہم یہ کہ بہت ہی گہرے جذباتی شعور کے ساتھ۔(15)

مابعد تقسیم دور میں وڑائچ اور اس کے خاندان کے روابط برقرار رہنا۔

تقسیم کے بعد لدّھے والا وڑائچ کے مکینوں کے ساتھ مالویندر کے روابط برقرار رہے اور ایک عشرے سے بھی کم وقت میں دوبارہ بحال ہو گئے۔ 1955ء میں اُس نے لاہور کا دورہ کیا اور ظہور الٰہی کا مہمان رہا۔ اصل میں وڑائچ کے برادرِ نسبتی اور دوسرے رشتہ داروں کو ایک کرکٹ میچ پر مدّعو کیا گیا تھا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے سرحد کھول دی گئی تھی اور ظہور الٰہی نے ایک ریڈیو چینل پر چیمہ اور بھنڈر کی تلاش کے حوالے سے اعلان بھی کروادیا تھا۔ انڈیا میں کسی اور شخص نے چیمہ اور بھنڈر (دونوں کرنال کے رہنے والے تھے) کو اس اعلان کے بارے میں بتایا اور وہ دونوں بھی آخر کار پاکستان پہنچ گئے۔ ظہور الٰہی نے ان دونوں کو یہ بھی بتایا کہ وہ ان سب کو تلاش کرنے کی کوششوں میں لگا رہا۔ بلکہ اس حد تک اپنائیت کا مظاہرہ کر دیا گیا کہ انکے خاندان سے یہ بھی پوچھ لیا گیا کہ وہ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات سے آگاہ کریں تا کہ ان کی تلافی کر دی جائے۔ اگرچہ اس اپنائیت اور نقصان کی تلافی کرنے کے جذبے کو سراہا گیا، تاہم جواب دیا گیا کہ وہ لوگ اب خود کو انڈیا میں مستحکم کر کے اپنے قدم دوبارہ جما چکے ہیں اس لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے بھی اہم یہ کہ اس دورے کے نتیجے میں وڑائچ خاندان کو اپنے رشتہ دار چوہدری

علی محمد سے ملاقات کا موقع فراہم ہوگیا تھا۔ 1958ء میں علی محمد نے گاؤں کے ایک چوکیدار کے ہاتھوں وڑائچ کے والد کی ایک تصویر بھجوائی جس نے وہ تصویر اسی دن ہی قرول باغ، نیو دہلی میں وڑائچ کو پیش کر دی تھی جس دن اس کی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ 1950ء کی دہائی میں اس طرح کے میل جول کی مثال واقعی مسحور کن ہے۔ (16) اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک 25 برس بعد 1983ء میں جبکہ علی محمد کا بیٹا اور اس کا برادر نسبتی وڑائچ کو ملنے کے لئے وہاں پہنچے تو انہی دِنوں اس کا نواسہ/پوتا پیدا ہوا۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ پاکستان میں بہت سے افراد کو ظہور الٰہی اور وڑائچ کے برادرانِ نسبتی، چیمہ اور بھنڈر کے درمیان دوستی کے رشتے کا علم تھا۔ تقسیم کے بعد کے دور میں پاکستان سے ایک خاندان کے لوگ آئے اور چیمے سے کہا کہ وہ ظہور الٰہی سے کہہ کر ان کا کام کروا دیں۔ چیمے نے بات کی تو ظہور الٰہی نے کام کروا دیا۔

اوتار سنگھ رنگ پور سے ہجرت کر کے چلے جانے کے اپنے فیصلے کے حوالے سے بتاتا ہے کہ، ''دیہات کے غیر مسلموں نے اپنا ذہن بنالیا تھا کہ وہ اگست 1947ء کے مہینے میں ہجرت کر جائیں گے۔ ایک مقامی مذہبی شخصیت کی رہنمائی پر ہم نے مقامی گوردوارے میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس وقت تک فسادات پھوٹ پڑے تھے اور فوج کی طرف سے بھی جانبداری کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اس عرصے کے دوران جبکہ ہم کچھ روز گوردوارے میں چھپے رہے تھے تو نمبردار غلام خان، سونا خان، اور احمد بٹ چوری چوری گوردوارے میں خوراک پہنچانے کے ساتھ ہی اندر چھپے ہوئے لوگوں کو یہ مشورہ بھی دیتے رہتے تھے کہ فرار کا مناسب وقت کونسا ہے۔ اسی دوران سکھوں کو گاؤں کا دورہ کرنے کا ایک انوکھا موقع بھی ہاتھ آ گیا، مگر یہ سب کچھ بہت احتیاط سے کیا گیا اور وہ بھی صرف اس وقت جب غلام خان اور احمد بٹ نے اُنہیں خبردار کر دیا تھا۔

15 روز تک گوردوارہ میں قیام کے بعد، غالباً اگست کے آخری ہفتے یا ستمبر کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ ہمیں بحفاظت سرگودھا کے مہاجر کیمپ تک پہنچا دیا گیا۔ بعد ازاں مہاجر کیمپ میں قیام کے ایک ماہ بعد ہم نے سرگودھا سے ایک ٹرین پکڑی جس نے ہمیں اکتوبر میں لدھیانہ پہنچا دیا۔''

اوتار سنگھ اور اس کے خاندان کی کہانی سے ملتی جلتی راولپنڈی کے ایک دوکاندار کی کہانی بھی ہے جس نے غیر مسلم آبادی کو خبردار کر کے ایک ایسی ٹرین پر چڑھنے سے روک دیا تھا جس پر اس کی اطلاع کے مطابق گاؤں کے مسلمان حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ پاکستان کے ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر چوہدری محمد اشرف، جن کا تعلق ضلع راولپنڈی سے ہے یوں گویا ہوتے ہیں:(17)

''غلام علی نے، جو کہ ایک دوکاندار تھا، بہت سے لوگوں کی جانیں بچائیں۔ اصل میں یوں ہوا تھا کہ غیر مسلموں کا اخراج پہلے سے ہی شروع ہو چکا تھا جس کی وجہ سے ضلع راولپنڈی میں فساد و ہنگامے کی ایک عمومی لہر شروع ہو چکی تھی جو کہ پھیل کر راولپنڈی شہر تک آ گئی تھی۔ چکوال (من موہن سنگھ کی جائے پیدائش) سے راولپنڈی تک صرف ٹرین ہی وہ واحد ذریعہ تھا جو بے یار و مددگار اقلیتی گروہوں کو محفوظ طریقے سے منزل مقصود تک پہنچا سکتا تھا۔ ایک دِن کچھ تخریبی ذہن رکھنے والے غنڈوں نے منصوبہ بندی کی کہ وہ ٹرین کو ویرانے میں رکوا کر بھاگتے ہوئے لوگوں کو لوٹنے اور ہلاک کرنے کی کاروائی کریں گے۔ غلام علی وہاں سے چپکے چپکے کھسک آیا اور دولتالہ سے جو کہ کھاتے پیتے لوگوں کا قصبہ تھا، متوقع طور پر فرار کی تیاریاں کرنے والوں کو خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ فرار کے لئے مناسب وقت کا انتظار کریں۔ اسی سہ پہر کو انسانی خون کے پیاسے غنڈوں نے ٹرین رکوالی مگر یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوئے کہ ان کی کاروائی کا نشانہ بننے والے مطلوبہ لوگ ٹرین میں موجود نہیں تھے۔ غلام علی چال کا پتہ چل جانے کے بعد، اُسے غدار قرار دے دیا گیا اور اسے کچھ عرصہ تک اپنی جان کے لالے بھی پڑے رہے۔''

انڈیا پہنچ جانے کے بعد اوتار سنگھ کے خاندان کو انبالہ اتار دیا گیا جو کہ مہاجرین کے پناہ لینے کے لئے ایک عام ٹھکانہ تھا۔ 1964ء میں اس کی تعیناتی لدھیانہ ہونے کے بعد اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ لدھیانہ مہاجرین کے حوالے سے شہرت رکھتا تھا کیونکہ بہت سے مسلمان وہیں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ دراصل سرگودھا سے بھی بہت سے لوگ نقل مکانی کر کے لدھیانہ منتقل ہو گئے اور اُنہوں نے وہاں معاشرتی اور اقتصادی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک مضمون میں اس نکتے کو یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

''سرگودھا سے تاریخی نقل مکانی کر کے جو لوگ یہاں آئے تھے اُن کے پاس ایک پائی

تک نہیں تھی۔ تاہم خدا نے ان کو بہت ہی توانائی اور حوصلہ عطا کیا ہوا تھا جس کی، بناء پر وہ دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔''(18)

تقسیم کے کچھ عرصے بعد تک اوتار سنگھ کا اپنے پرانے دوستوں سے رابطہ برقرار رہا۔

1974-75 میں پاکستان سے کچھ لوگوں پر مشتمل وفد نے فتح گڑھ صاحب میں ایک اہم مذہبی درگاہ کا دورہ کیا تھا، جو کہ سکھوں کے لئے بھی ایک اہم مقدس مقام ہے۔ اس وفد نے اوتار سنگھ کے بارے میں دریافت کیا اور یوں اس کی اپنے کچھ پُرانے دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ چند برسوں کے بعد 1980ء میں اس نے پاکستان کا دورہ کیا مگر یہ صرف ننکانہ صاحب اور پنجہ صاحب کی زیارت تک ہی محدود رہا۔ اس دورے کے دوران اسے زیادہ لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر نہ آ سکے۔

اوتار سنگھ نے 1980ء میں اپنی سرکاری ملازمت سے وقت سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی جس کے بعد اس نے اپنا ذاتی کاروبار قائم کیا اور اس کا نام اپنے گاؤں رنگ پور کے نام پر رکھا۔ 1994-95 میں وہ ایک مذہبی وفد کے ساتھ پاکستان کے دورے پر آیا۔ اس وفد کا سربراہ دہلی کا ایک مذہبی رہنما ستوکھ سنگھ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ننکانہ صاحب میں زیارت کے لئے بہت سے لوگ سرگودھا سے بھی آئے تھے۔ اُن میں سے اکثر لوگوں کی آنکھوں میں یہ جان کر آنسو آ گئے کہ اس وفد میں اُن کا کوئی ایک دوست بھی شامل نہیں تھا۔

وہ پرانی یادوں کھنگالتے ہوئے کہنے لگا کہ اُسے پاکستان کے پردے پر بے پناہ پذیرائی ملی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ دوبارہ پاکستان جائے مگر اپنی مصروفیت میں سے کبھی اتنا وقت نکالنے کے قابل نہیں ہو سکا کہ یہ خواہش پوری کر لیتا تاہم اس نے سرحد کے اس طرف ایک اور رنگ پور آباد کر لیا ہے اور اسے اپنے اس اختراع کردہ نام سے ہی بہت تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔

## دلیپ سنگھ: مسلمانوں کی مدد سے دریائے راوی پار کرنے والا

دلیپ سنگھ نے سرگودھا کی اُس وقت کی تحصیل خوشاب میں جنم لیا تھا جو کہ اب پاکستان میں سرگودھا ڈویژن کا ایک ضلع بن چکا ہے۔ اگرچہ اب اس کی عمر 89 برس ہو چکی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہا کہ تقسیم کے دور کے تجربات کو صحیح طرح سے یاد کر کے دہرا سکے، تاہم اس کا بیٹا جسپال

سنگھ جو کہ تقسیم کے ایک برس بعد پیدا ہوا تھا اپنے والد کے فرار کا قصہ کئی مواقع پر سُن چکا ہے۔ اس کے بیٹے کی طرف سے کی گئی منظر کشی ''مابعد یادداشت'' کی ایک بہت اہم مثال ہے۔ دلیپ سنگھ کے 60 سالہ بیٹے کے علاوہ اُس کے پوتے کو بھی اس امر کا اچھی طرح علم تھا کہ اس کے دادا کی زندگی مسلمانوں نے بچائی تھی۔ دلیپ سنگھ نے یہ واقعہ کئی مرتبہ بیان کیا ہے۔ اس کے گھر والوں نے بھی سرحد کے اُس پار بہت سے گھرانوں کے ساتھ روابط برقرار رکھے ہیں اور حتیٰ کہ اس کے پوتے/پوتیاں، نواسے/نواسیاں وغیرہ بھی کئی مرتبہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔

دلیپ سنگھ نے لائل پور خالصہ کالج سے بی۔ اے کیا تھا اور اس کے بعد اس پنجابی کے آنرز کے برابر ایک اور ڈگری لی جسے گیانی کہتے ہیں۔ اس نے انڈسٹریل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا تھا اور اس کا اپنا ایک ٹرانسپورٹ بزنس تھا جس کا نام منٹگمبری ٹرانسپورٹ تھا اور جو 1942ء میں قائم کیا گیا تھا۔

اگست میں جبکہ فسادات شروع ہو چکے تھے، دلیپ سنگھ کے دوستوں نے اسے ترغیب دی کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر اپنی جان بچالے۔ اس کا کاروبار سرگودھا میں تھا اور وہ 10 اگست کو لاہور چلا گیا یہ یقین کئے بغیر کہ فسادات شروع ہو چکے تھے۔ بہر حال جیسا کہ اس کی قسمت تھی فسادات شروع ہو چکے تھے اور وہ بے یار و مددگار تھا۔ اس کے چند ایک مسلمان دوستوں نے مہربانی کرتے ہوئے اسے مسجد میں پناہ دے دی۔ اگلے روز اس کے دوستوں نے اُسے دریائے راوی پار کرانے میں مدد دی اور اس مقصد کے لئے اُنہوں نے کچھ ڈرم لئے اور اُن کے دونوں جانب رسیاں باندھ دیں۔ ایک جانب سے ڈرم اُس کے دوست دھکیلتے جبکہ دوسری طرف اس کے دوست ڈرم اپنی جانب کھینچ لیتے۔ اگر چہ دلیپ سنگھ پہلی کوشش میں اپنے سارے خاندان کو بچا لینے میں کامیاب نہ ہو سکا، تاہم وہ واپس آیا اور خاندان کے باقی افراد کو بچالے گیا۔ وہ آخر کار ڈیرہ بابا نانک کے راستے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے خاندان نے ابھی تک پاکستان میں بہت سے افراد سے رابطہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے بیٹے جسپال سنگھ نے ہمیں بہت سے تحائف دِکھائے جو پاکستان سے ان کے دوست احباب اکثر و بیشتر بھیجتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے کئی مواقع پر پاکستان کا دورہ کیا ہے اور یہاں کی مذہبی درگاہوں کی زیارت بھی کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان سے اعتزاز احسن جیسی معروف

شخصیات بھی ان سے ملنے آ چکی ہیں موخرُ الذکر نے 2003ء میں ان کے گھر کا اُس وقت دورہ کیا تھا جب وہ پالیمانی وفد کے ساتھ انڈیا گیا تھا اور اپنی کتاب ''انڈس ساگا'' کی ایک نقل بھی ان کو دی تھی۔ اعتزاز احسن نے نہ صرف یہ کہ جسپال سنگھ کو دورے کی دعوت دی تھی بلکہ سکھوں کے مقدس مقامات کے حوالے سے بھی مکمل یقین دہانی کروائی تھی۔

اُن کا پاکستان میں دوسری معروف شخصیات مثلاً سردار محمد اقبال، اور مشہور سیاسی شخصیت چوہدری احمد مختار کے بھائی چوہدری احمد جاوید وغیرہ سے بھی رابطہ ہے۔ جسپال سنگھ کا کہنا ہے کہ ''1989ء میں روٹری کلب کے وفد مین شامل ہو کر لاہور کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ اس وقت کے وزیر خارجہ وآرا اہل بھاٹیہ کے خاندان کے افراد بھی آئے ہوئے تھے۔ اس دورے کے دوران بھاٹیہ خاندان کے لوگوں نے میرا تعارف سردار محمد اقبال سے کروایا۔ موخرالذکر تقسیم سے قبل کے زمانے میں لاہور کے ایک تعلیمی ادارے میں اقبال صاحب کے ہم جماعت تھے۔ جواباً سردار محمد اقبال نے ہمارا تعارف چوہدری احمد مختار کے بھائی چوہدری احمد جاوید سے کروالیا۔ ہم دونوں خاندانوں کے بہت قریب ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے 1998ء میں اقبال صاحب کی پوتی/نواسی کی شادی میں بھی شرکت کی تھی اور اس دوران ہمارا قیام چوہدری احمد جاوید کے گھر رہا۔''

اپنے والد صاحب اور خاندان کے دیگر افراد کے دورے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ، ''میرے والد صاحب دلیپ سنگھ کو 1970ء کی دہائی میں پاکستان کے اندر سکھوں کے مقدس مقامات کی زیارت کے سلسلے میں آنے کا موقع ملا تھا، اور 1980ء کی دہائی میں بھی۔ بدقسمتی سے اُسے اپنے آبائی شہر سرگودھا کے دورے کا کبھی موقع نصیب نہیں ہوا۔ میں ایک میٹالرجیکل انجینئر ہوں اور میرا ٹیکسٹائیل مشینری کا کاروبار ہے۔ چنانچہ دوستوں سے ملاقات کے علاوہ ایک وجہ کاروباری امور نمٹانا بھی ہوتی ہے۔ 1993ء میں ایک سیمینار کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تھا۔ اس کے بعد میں اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں جبکہ میری بیٹی سال میں 2 یا 3 مرتبہ دورہ کر آتی ہے۔

جسپال سنگھ نے دور اور دلچسپ نکات بھی بیان کئے۔ ایک تو یہ کہ شادیوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے اس کے خاندان کی پاکستان میں بہت سے لوگوں سے دوستیاں بن گئی ہیں۔ سماجی میل جول کے مواقع مثلاً شادیوں وغیرہ میں شمولیت سے مستحکم تعلقات بنانے کی روایت

بہت سی دوسری مثالوں میں بھی عام نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے یہ بھی منکشف کیا کہ سردار محمد اقبال نے ان کی 1989ء میں ہونے والی پہلی ملاقات کے بعد سکھ مذہب میں اچھی خاصی دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے کتب خانے میں سکھ مذہب پر کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔

دلیپ سنگھ کی مثال کا جائزہ لینا بہت دِل چسپی کا حامل کام ہے۔ مابعد تقسیم انڈیا میں، جہاں بہت سے مہاجرین نے مسلمانوں کے لئے تعصب کا مظاہرہ کیا وہاں دلیپ سنگھ نے (اس کے بیٹے کے بقول) مسلمانوں کے ساتھ کاروبار کرنے کو ترجیح دی کیونکہ ایک تو اس کی ماضی میں یہاں بہت سی دوستیاں رہی ہیں اور دوسرے یہ کہ اُسے اردو زبان سے بہت محبت رہی ہے۔ چونکہ وہ خود بھی ایک مشہور اردو لکھاری رہا ہے اس لئے اُردو کے دو اخباروں کی نقول بلا قیمت ملتی رہی ہیں اور وہ ہیں ملاپ اور ہند سماچار۔

## ڈاکٹر سنتو کھ سنگھ: پاک، بھارت خیر سگالی کا ''جراح''

ڈاکٹر سنتو کھ سنگھ جس کی عمر 67 برس ہے، ایک معروف جراح/سرجن ہے اور امرتسر میں وریام سنگھ کلینک کے نام سے ایک بہت بڑا نجی ہسپتال چلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا شمار شہر کی مشہور فلاحی شخصیات میں بھی ہوتا ہے اور بہت سے فلاحی و خیراتی اداروں سے وابستہ ہے۔ وہ تقسیم سے چند ماہ قبل 7 برس کی عمر میں سلامت پورہ لاہور سے امرتسر میں بھکھی ونڈ نامی دیہات مُنتقل ہو گئے تھے۔ یہاں ان کی مثال کا جائزہ لینا بھی بہت دلچسپ رہے گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے والد صاحب وریام سنگھ کو اگست 1947ء میں ان کے مسلمان دوستوں نے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دی تھی اور دوسری یہ کہ تقسیم کے چند ماہ بعد ہی ان کے والد صاحب کے دوستوں نے واہگہ بارڈر کا دورہ کر کے ان کی وہ امانتیں واپس لوٹا دی تھیں جو وہ ان کے پاس چھوڑ کر آئے تھے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ وہ جس گھر میں اس وقت رہائش پذیر ہے وہ ایک مسلمان کی حویلی تھی، جو کہ 1909ء میں تعمیر کی گئی تھی جو کہ اس کے والد صاحب کی پیدائش کا سال بھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سنگھ اور اس کے خاندان کے سرحد پار اپنے دوستوں اور جان پہچان کے لوگوں سے بھی تعلقات مسلسل برقرار رہے ہیں۔

اپنی داستان کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر سنگھ نے بتایا کہ ان کے گاؤں سلامت پورہ میں جو کہ لاہور شہر کے نواح میں واقع تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے بہت قریبی مراسم تھے۔ گاؤں کا نمبردار اس کے والد صاحب، وریام سنگھ کا جن کے کہ شہر کے نواح میں اینٹوں کے بھٹے ہوتے تھے، بہت اچھا دوست تھا۔ اپریل 1947ء میں اُس کے والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ خاندان کو امرتسر بھجوادیا جائے کیونکہ اُنہوں نے بعض مسلمانوں کے ہجوم اپنے گھر کے گرد منڈلاتے دیکھے تھے۔ ڈاکٹر سنگھ نے جو کہ اس وقت دوسری جماعت کا طالب علم تھا مارچ 1947ء میں اپنے اسکول سے باہر نکلتے وقت مسلم لیگیوں کے کچھ گروہوں کو منڈلاتے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر سنتوکھ سنگھ کے والد کے علاوہ ان کا باقی خاندان اپریل 1947ء میں امرتسر کے نواح میں واقع گاؤں بھکھی ونڈ میں سکونت پذیر ہوگیا۔

جیسے ہی وریام سنگھ کو تقسیم کی حقیقت سے آگاہی ہونا شروع ہوئی اُس نے امرتسر میں کاروبار کے مواقع تلاش کرنا شروع کردیئے۔ اسی حوالے سے شہر کے ایک دورے کے دوران، جولائی 1947ء میں اُس کے والد صاحب نے ایک مسلمان لڑکے کی جان بچانے کی کوشش کی جسے ہندوؤں اور سکھوں نے چاقو کے وار کر کے زخمی کردیا تھا۔ وہ ایسے ایک قریبی ہسپتال لے گئے۔ اس وقت تک بڑے پیمانے پر فسادات پھوٹ پڑے تھے اور ان کے دوست گاؤں کے نمبردار نے انہیں بتایا کہ حالات قابو سے باہر ہوچکے تھے اور یہ کہ اُن کی زندگی خطرے میں تھی۔ جب تک کہ وہ وہاں سے چلے نہیں گئے، نمبردار نے اس امر کو یقینی بنائے رکھا کہ وریام سنگھ کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اگر نمبردار کا بروقت اور پُرخلوص مشورہ وتعاون حاصل نہ ہوتا تو سنگھ کے لئے وہاں سے بحفاظت نکل جانا غالباً ناممکن ہوتا۔

اُس نے 14 اگست کی شام کو پاکستان کے یوم آزادی والے دن لاہور چھوڑ دیا اور فیروز پور کے راستے سے بھاگ کر امرتسر پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی کچھ قیمتی چیزیں گاؤں کے نمبردار کے پاس رکھ چھوڑیں۔

ڈاکٹر سنتوکھ سنگھ اپنی یادداشت کھنگالتے ہوئے بتاتا ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد چند ماہ تک مختلف گروہوں کو واہگہ بارڈر پر ملتے اور ایک دوسرے کی امانتیں حوالے کرنے کی اجازت مل گئی تھی اسی طرح ایک ملاقات کے دوران اُس کے والد کے دوست نے ان کی امانت واپس کردی

تھی، حالانکہ زبانی یا دداشتوں میں اس طرح کا نکتہ شاذ و نادر ہی سامنے آتا ہے۔ اعتماد کا رشتہ یقیناً بہت گہرا رہا ہوگا جیسا کہ نمردار نے مخصوص قیمتی امانتیں وریام سنگھ کو واپس لوٹا دی تھیں۔

موخرالذکر نے تقسیم کے بعد کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ اُنہوں نے 1997ء کے دوران نیلامی میں جو گھر خریدا تھا وہ ایک مسلمان خاندان کا تھا جنہوں نے بعدازاں 70 کی دہائی میں اس گھر کو دیکھنے کے لئے یہاں کا دورہ بھی کیا تھا۔ بہت سے دیگر افراد کی طرح اس نے بھی اس امر کا انکشاف کیا کہ 1950ء کی دہائی میں سرحد کے اس پار آنا اور جانا بہت آسان تھا۔ اسے 1955ء میں ایک کرکٹ میچ کے سلسلے میں لاہور کے دورے کا اتفاق ہوا تھا جہاں اس کے مسلمان میزبان نے جو کہ اس وقت لاہور کا چیف انجینئر تھا اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

1970ء کی دہائی میں ڈاکٹر رشید نامی ایک خاندانی شخصیت کی اس کے برادرِ نسبتی سے جو کہ ہڈرفیلڈ، برطانیہ میں سکونت پذیر تھا، اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ اس طرح کی دوستی دوسرے ممالک میں قیام پذیر انڈین اور پاکستانیوں اور خاص طور پر سرحد کے دونوں طرف واقع پنجاب کے باشندوں کے درمیان عام ہے۔ اور یہ بات بجا طور پر کہی گئی ہے کہ برصغیر سے باہر اس طرح کی دوستیوں کے پروان چڑھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ:

''انڈین' یا 'پاکستانی'، 'ہندو'، 'مسلمان'، یا 'سکھ' کی بجائے پنجابی کہلانے سے سرحد کے دونوں اطراف رہنے والے پنجابیوں کے باہمی تعلقات میں آخر کار آسانی پیدا ہوسکتی ہے جو کہ جنوبی ایشیاء میں بصورت دیگر ایک ناممکن سی چیز ہے۔''(18)

حقیقت میں یہ ایک دلچسپ نکتہ ہے کہ اگرچہ انڈین اور پاکستانی برصغیر کے اندر رہتے ہوئے اپنے باہمی تعلقات کے حوالے سے ہمیشہ گومگو کی یا غیر یقینی کیفیت میں رہے ہیں، تاہم جب وہ دوسرے ممالک میں آباد ہوگئے تو انہیں آپس میں گھلنے ملنے میں دیر نہیں لگی۔(19)

پاکستان کے ایک چوٹی کے گائناکولوجسٹ ڈاکٹر رشید نے 1980ء کی دہائی میں ڈاکٹر سنگھ سے ملاقات کرنے کے ساتھ ہی ان کی کلینک کا دورہ کیا اور وہاں درخواست کئے جانے پر ایک عدد سرجری بھی کر ڈالی۔ یہ دوستی بہت دیرپا ثابت ہوئی اور اب ان کے بچے بھی آپس میں بہت اچھے دوست بن چکے ہیں۔ جب کبھی ڈاکٹر سنگھ کا کوئی دوست پاکستان کا دورہ کرتا ہے تو ڈاکٹر رشید

اس کی پُرخلوص میزبانی کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اول الذکر نے ڈاکٹر رشید کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے پاکستان کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر سنگھ نے دس مرتبہ سے زیادہ پاکستان کا دورہ کیا ہے جبکہ اس کے اہل خانہ بھی اکثر و بیشتر یہاں آتے رہتے ہیں۔

مستقبل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سنگھ بالکل واضح خیالات رکھتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس کے پڑھنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے امن اور دوستی کا راستہ۔ امرتسر چونکہ ایک سرحدی شہر ہے اس لئے جنگ کی صورت میں سب سے زیادہ شامت اسی شہر کی آتی ہے، بصورت دیگر سرحد پار تجارتی سرگرمیوں کے فروغ کا سب سے زیادہ فائدہ اسی شہر کو ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ نظر آرہا ہے، پاکستان کے ساتھ تجارت کا راستہ کھل جانے کی بناء پر معیشت بہتری کی جانب گامزن ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

## پریتم سنگھ ہنڈال

پریتم سنگھ ہنڈال کی داستان تین وجوہات کی بناء پر مناسبت یا موزونیت کی حامل ہے۔ پہلی تو یہ کہ اُس کی زندگی ایک مسلمان خاندان نے بچائی تھی اور اسے چند روز تک پناہ بھی دیئے رکھی۔ دوسری یہ کہ اگرچہ اس کی خالہ یا پھوپھو کو پاکستان میں ہی رہنا پڑ گیا اور وہ بعد ازاں مسلمان ہوگئی، مگر ہنڈال کی خوش قسمتی کہ تقسیم کے بعد پاکستان کے پہلے دورے کے دوران ہی اس سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تاہم بدقسمتی سے وہ بعد کے دوروں میں یہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک ایسی تنظیم کا صدر ہے جس کا نام ''جاتی عمرہ، (جو کہ نواز شریف کا آبائی گاؤں بھی ہے) انڈو۔ پاک پریوار ملاپ ٹرسٹ ہے اور جس کا بنیادی مقصد بچھڑے ہوئے خاندانوں کا ملاپ کرانا تھا۔

ہنڈال نے 20 دسمبر 1937ء کو گاؤں کھیوا ہنڈالاں، ضلع سیالکوٹ میں جنم لیا۔ اس وقت کی مردم شماری (21) کے مطابق سیالکوٹ ضلع کی آبادی گیارہ لاکھ نوے ہزار تھی جس میں 7 لاکھ 39 ہزار آبادی سکھوں کی تھی اور 62 فیصد لوگ مسلمان تھے۔

تقسیم سے قبل کے سماجی حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ گاؤں کی آبادی زیادہ تر جاٹوں، سکھ اور مسلمان دونوں، تھوڑے بہت ہندوؤں اور غیر جاٹ سکھوں پر مشتمل تھی۔

لُطف کی بات یہ ہے کہ بہت سے مسلمان بھی ایسے تھے جو کہ ہنڈال تھے۔

بہت سے دوسرے خاندانوں کی طرح اس کے اپنے اہل خانہ نے بھی تقسیم کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ حکمران تبدیل ہوتے ہیں مگر رعایا وہی رہتی ہے حتیٰ کہ جب دوسری جگہوں پر فسادات شروع بھی ہو گئے پھر بھی ان کا یہی خیال تھا کہ ان کا گاؤں بالکل محفوظ ہے کیونکہ یہاں کافی حد تک مخلوط ثقافت اور یگانگت پائی جاتی تھی۔ اگرچہ بعض فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں، خاص طور پر ہندوؤں اور بعض غیر جٹ سکھوں نے وہاں سے ہجرت کر جانے کے بارے میں سوچنا بھی شروع کر دیا تھا، مگر جٹ سکھ وہاں سے نہ جانے پر مصر رہے۔

جب حالات قابو سے باہر ہونا شروع ہو گئے تو 20 اگست کے قریب قریب وہ اگلے دیہات بالو پور روانہ ہو گئے جو کہ ان کے گاؤں سے دو میل سے کم کی مسافت پر تھا۔ یہاں پر ایک مسلمان خاندان نے جو کہ بنڈال بھی تھے اور جن کے کچھ افراد فوج میں بھرتی تھی، پریتم سنگھ کے خاندان والوں کو 2 دن کے لئے پناہ دے دی۔ تاہم جب فسادات میں تیزی آ گئی تو اُنہوں نے کہا کہ مزید پناہ دینا ان کے لئے مُشکل ہے۔ آخر کار اس مسلمان خاندان نے دو روز بعد اُنہیں بحفاظت گاؤں بنڈال پہنچا دیا۔

چند روز بعد ہنڈال اور اس کا خاندان ہندوؤں اور سکھوں کے ایک ایسے قافلے میں شامل اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے جس کی سربراہی یا کمان ایک قابلِ احترام مذہبی شخصیت سنت ستگر دیو سنگھ آف میر پور خاص کے پاس تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسا بہت سے دوسری صورتوں میں دیکھنے میں آیا، ہنڈال کے والد صاحب نے بھی اپنی بعض قیمتی اشیاء کسی دوست کے پاس یہ سوچ کر رکھوا دی تھیں کہ وہ جلد ہی واپس لوٹ آئیں گے۔ بہت سے اور کی طرح اس کی پھوپھی امرکور جسے بعد میں بے بے ہنڈال (ایک بڑی عمر کی خاتون کو پنجاب میں بے بے کہتے ہیں) کہا جانے لگا اور اس کے خاوند نے پاکستان رہنے کا فیصلہ کر لیا اور مسلمان ہو گئے۔ ہنڈال کا خاندان اگست کے تیسرے ہفتے کے لگ بھگ نارووال کیمپ جو کیمپ پہنچ گیا کیمپ پہنچنے کے بعد اس کے والد صاحب نے بعض قیمتی اشیاء واپس لے آنے کے لئے دیہات کا چکر لگانے کا اِرادہ کیا مگر اُنہیں یہ کہہ کر ایسا کرنے سے روک دیا گیا کہ اب یہ سب بے سود تھا۔ اُنہوں نے نارووال سے سرحد پار کی اور کوئی مسئلہ بھی پیش نہیں آیا سوائے جسٹر کے جو کہ پاکستان کی طرف آخری سٹاپ تھا

اور جہاں مسلمانوں کے ایک بڑے ہجوم نے ان پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی تاہم چونکہ ان کا قافلہ بہت بڑا تھا اس لئے اُنہیں چھوڑ دیا گیا۔

اُن کا قافلہ بہت خوش قسمت تھا کہ بچ گیا تھا کیونکہ ایک اور قافلے کو جو کہ غیر مسلموں پر مُشتمل تھا اسی راستے پر دو ماہ بعد حملہ کر کے کافی نقصان پہنچایا گیا تھا۔ بی ڈی کھوسلہ کے بقول:(22)

''23 اکتوبر کے روز غیر مسلم مہاجرین کا ایک بڑا سا قافلہ سیالکوٹ سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا۔ جسڑ سے آگے ٹریک خراب تھا اور سیالکوٹ ڈسٹرکٹ لی ایژن آفیسر نے ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی کہ مہاجروں کو بذریعہ ٹرین روانہ کرنا نامناسب رہے گا کیونکہ اُنہیں راستے میں اُتر کر ایسے علاقے سے پیدل گزرنا پڑے گا جو کہ تخریبی کاروائیوں میں ملوث مسلمانوں کا گڑھ ہے۔ تاہم ڈپٹی کمشنر نے اس مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے بذریعہ ٹرین بھیجنے پر ہی اصرار جاری رکھا اور جسڑ کے مقام پر تمام مہاجرین کو نیچے اُتر کر پیدل چلنا پڑا۔ قافلہ ابھی نصف میل ہی دور پہنچا ہوگا کہ اُس پر گنے کے کھیتوں میں چھپے ہوئے مسلح مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم نے حملہ کر دیا۔ یہ حملہ دو گھنٹوں تک جاری رہا اور مہاجرین جان بچانے کے لئے ہر سمت دوڑتے رہے ..... مہاجرین کی ساری اشیاء لوٹ لی گئیں اور ان میں سے بہت سے لوگ انڈیا کی سرحد پر اس حالت میں پہنچے کہ اکثریت کے جسم پر لباس تک بھی نہیں تھا۔ ایک فوجی افسر نے جو کہ حملے کے مقام کے اوپر سے بذریعہ ہوائی جہاز گزر رہا تھا، دیکھا کہ سارا کا سارا علاقہ جھتھڑوں اور مردہ اجسام سے پٹا پڑا تھا۔''

بہت سے دیگر انٹرویو کئے گئے افراد کی طرح ہنڈال نے بھی یادداشت کا سہارا لیتے ہوئے بتایا کہ جس دن وہ سرحد کے اس پار پہنچے تو بہت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش کی بناء پر پہلے سے ہی تکلیف دہ سفر مزید ناخوشگوار ہو گیا۔

تقسیم کے بعد ہنڈال اور اس کے خاندان کو تحصیل بٹالہ میں واقع پنج کڑھی نامی دیہات میں جو کہ مسلم اکثریت کا گاؤں تھا اور جہاں صرف دو ہی مکان تھے، زمین دے دی گئی۔ اُس نے بڑے فخر سے بتایا کہ مقامی افراد کی تخلیقی صلاحیتوں اور محنت کے نتیجے میں اب گاؤں کافی ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔

ہنڈال نے تقسیم کے بعد 1986، 1994، اور 1998 میں پاکستان کا تین مرتبہ دورہ کیا اور اپنے میزبانوں کی مہمان نوازی سے بہت ہی متاثر ہوا۔

1986ء میں، چونکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھا، اس لئے سکھ زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ وہ بھارتی حکومت کے ایک مُیعر کے طور پر بھی یہاں آیا تھا تا کہ اس امر کو یقینی بنایا جاسکتا کہ اُنہیں یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسے اس دورے کے دوران اپنے گاؤں جانے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ تاہم اُس نے ایک آدمی کے ذریعے اپنی پھوپھو اور پھوپھا سے رابطہ کر کے اُن سے ملاقات کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اصل میں یہ آدمی اُنہیں ننکانہ صاحب لے آیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس بندے کو ہنڈال نے اُنہیں لے آنے کے لئے بھیجا تھا وہ اصل میں ایک سکھ تھا جو عیسائیت اختیار کر چکا تھا۔

1994ء میں ہنڈال نے ایک لی ایژن افسر کی حیثیت سے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اس کی پھوپھو فوت ہو چکی تھیں مگر پھوپھا ابھی تک زندہ تھے۔ اس دورے کے دوران اُسے سکھوں کے تمام مقدس مقامات کی زیارت کا موقع بھی مل گیا۔ 1998ء میں وہ انڈو۔ پاک پریوار ملاپ ٹرسٹ کے رکن کے طور پر بھی آنے کا موقع ملا۔ اس ٹرسٹ کے سربراہ کرنل پرتاب سنگھ گل تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بچھڑے ہوئے خاندانوں کو آپس میں ملوا دیا جائے۔ اس ٹرسٹ کا ایک رُکن ارجن سنگھ اور نواز شریف کے والد قریبی دوست تھے۔ کیونکہ دونوں تعلق ایک ہی گاؤں سے تھا اور وفد کی میزبانی بھی موخرالذ نے کی تھی۔

ہنڈال نے اپنے ذاتی تجربات کے علاوہ نواز شریف کے ساتھ اپنے میل جول کی بنیاد پر بعض دلچسپ انکشافات کئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ نواز شریف کو اپنے گاؤں سے کتنی محبت ہے۔

ایک تو یہ کہ نواز شریف نے وفد کا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ سکھوں کے مقدس مقامات کی دیکھ بھال کے حوالے سے انتہائی مثبت رویے کا اظہار کیا گیا۔ ہنڈال کے ساتھ بیٹھتے ہوئے نواز شریف نے اس کے آبائی مقام کے بارے میں دریافت کیا جب ہنڈال اُسے اپنے آبائی گاؤں کا نام بتایا تو نواز شریف نے فوراً اپنے پراٹوکول آفیسر کو بلال کر ہدایت دی کہ ہنڈال کے لئے اُس کے گاؤں کے دورے کا انتظام کیا جائے۔ اس دورے کے دوران اُس کے سابقہ آبائی گاؤں کے مکین چودھری عبدالغفار خان نے اُس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ خاں تقسیم

کے دوران امبالا سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ اُس کے صرف دو ہم جماعت یعنی راج مسیح اور محمد صادق ہی تھے جو ابھی تک زندہ تھے۔ ہنڈال کو اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کا موقع بھی ملا جن میں سے ایک درشن سنگھ تھا جو کہ بعد میں لال دین بن گیا جبکہ تقسیم کے پیدا ہونے والے دو رشتہ دار لیاقت علی اور صوبہ خان تھے۔

ہنڈال کو نواز شریف کے پنجاب سے عمومی اور اپنے گاؤں جاتی عمرہ سے خصوصی لگاؤ نے بھی متاثر کیا۔ یہ بہت سے دیگر پنجابیوں میں بھی پایا جانے والا ایک عام جذبہ ہے۔ اس سے نواز شریف کی اپنے پشتینی گاؤں سے محبت کی ایک بڑی دلچسپ مثال سامنے آتی ہے۔ جاتی عمرہ کے ساتھ شریف خاندان کے روابط ان کے والد صاحب کی وجہ سے قائم رہتے چلے آ رہے ہیں جو کہ گاؤں کے بہت سے خاندانوں کے ساتھ رابطہ رکھتے رہے ہیں، اگرچہ وہ تقسیم سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ انکے والد صاحب نے 1982ء میں گاؤں کا دورہ کیا تھا اور گاؤں کے بہت سے نوجوانوں کو سعودی عرب بھجوانے میں مدد دے چکے ہیں۔ (23) اور آخری بات یہ کہ اس حقیقت کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نواز شریف نے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''اُسے پنجاب کے لوگوں سے شدید محبت ہے اور اس تصوّر سے ہی اُس کا دل ڈوب جاتا ہے کہ اگر جنگ کے دوران اُس کی سرزمین پر بم باری ہوگئی تو کیا ہوگا۔'' (24)

1999ء میں وزیراعظم واجپائی کی سربراہی میں انڈیا سے آنے والا ایک وفد نواز شریف کے لئے تحفے کے طور پر جاتی عمرہ کی مٹی لے آیا تھا۔ نواز شریف تحفہ وصول کرتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ (25) حال ہی میں جب شریف برادران جلاوطنی کے بعد پاکستان آئے تو جاتی عمرہ کے مکینوں نے اُن کی صحت یابی کے ساتھ ساتھ اُن کے اقتدار میں واپس آنے کی دُعا بھی کی۔ دسمبر 2007ء میں اُن کے گاؤں کے کچھ لوگ انھیں بذاتِ خود بھی ملنے آئے تھے۔ ان کی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ کی بہترین کارکردگی پر ان کے آبائی گاؤں میں جشن اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ (26)

گذشتہ برس ہنڈال کے بھائی سرجیت سنگھ نے سیالکوٹ کا دورہ کیا جہاں اُسے اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ ہنڈال ابھی تک محمد صادق سے رابطے میں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں خطوط کے تبادلے کے ساتھ ہی کبھی کبھار ایک دوسرے کو ٹیلی فون بھی

کر دیتے ہیں۔ ہنڈال بچھڑے ہوئے خاندانوں کو ملانے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔

## ہربھجن سنگھ: جسے اس کے وفادار ملازم نے بچایا

81 سالہ ہربھجن سنگھ، ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم جس کا تعلق اصل میں منٹگمری سے ہے جو کہ اب ساہیوال کہلاتا ہے، دہلی کے پنجابی باغ کے علاقے میں رہتا ہے۔ اس کے والد کے ایک ملازم نے، جو کہ افضل خان نامی مسلمان تھا، ان لوگوں کو ان کے اپنے گھر سے ایک رات بُرقعے پہنا کر گاؤں کے گوردوارے تک فرار ہونے میں مدد فراہم کی تھی۔ اس کی کہانی کا ایک اور حیران کُن پہلو یہ ہے کہ دوسرے بے شمار لوگوں کی طرح اس کے والدین کو بھی یہ یقین تھا کہ وہ ایک دِن اپنے گھر واپس آ جائیں گے اور اس لئے اُنہوں نے اپنے مکان کی چابیاں تک کسی کے حوالے نہیں کی تھیں۔

اوکاڑہ سے چھپنے والے ایک اخبار نے اس جگہ کے حوالے سے بعض دلچسپ حقائق کا تذکرہ کیا ہے اور اس میں یہ حقیقت بھی شامل ہے کہ یہ تقسیم سے قبل کے پنجاب کا ایک اہم زرعی قصبہ تھا۔(27)

''اوکاڑہ لاہور سے 100 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور 1908ء میں برطانوی حکومت نے یہاں 25 کے قریب زرعی فارم بنا کر اس قصبے اور اس کے گردونواح کے علاقوں کی ترقی میں بہت سنجیدگی سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ہر فارم 17013 ایکٹر (6805 سیکٹر) زمین پر مشتمل تھا۔ سارے پنجاب سے کسانوں کو یہاں زرعی زمین کے قطعات عطا کئے گئے تھے اور پھر یہ علاقہ بتدریج ترقی کرنا شروع ہو گیا۔ یہ تقسیم سے قبل پنجاب کے ضلع منٹگمری کا حصہ تھا۔''

ہربھجن سنگھ کو اوکاڑہ کی بڑی سی غلہ منڈی اور مشہور صنعت کار جی۔ ڈی برلا کی ستلج کاٹن ملز ابھی تک یاد ہے۔ اس ملز پر اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس کے مالک اور اس کی طرف سے تینوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی مل میں بھرتی کے حوالے سے بہت دلچسپ تفصیلات دی گئی ہیں۔(28)

''مرحوم گھن شیام داس برلا جس کا شمار انڈیا کی عظیم ترین کاروباری اور مخیّر شخصیات میں ہوتا ہے، آج کے پاکستان میں صرف ایک ہی مل کا مالک تھا اور وہ مل اوکاڑہ میں تھی۔ مل کا نام ستلج

کاٹن ملز تھا ملز کی خالص قدر 1947ء میں 3 کروڑ تھی جس میں سے 2 کروڑ سٹاک میں اور ایک کروڑ پلانٹ اور مشینری وغیرہ میں سرمایہ کاری کی صورت میں تھے۔مل میں 4000 کے قریب ملازم تھے جن میں ہندو، سکھ، اور عیسائی سب شامل تھے۔ 1947ء میں اگست کے مہینے میں اوکاڑہ میں فرقہ ورانہ حالت بہت خراب ہوگئی تھی اور غیر مسلم ملازمین اپنی جانوں اور اموال کے حوالے سے سخت پریشان تھے۔''

اوکاڑہ میں تقسیم سے قبل کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر بھجن سنگھ بتاتا ہے کہ

''میرے والد صاحب ایک کاروباری شخصیت تھے اور ہمارے پاس کام کرنے والے کچھ ملازم مسلمان تھے۔ میں نے میٹرک کا امتحان مقامی ایم۔بی۔ہائی اسکول سے پاس کیا تھا۔ ایک مرحلے پر میں نے سکھ نیشنل کالج لاہور میں داخلہ لینے کا بھی سوچا تھا، مگر میں نے یہ خیال اس وقت ترک کر دیا جب مجھے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی۔''

مختلف فرقوں کے مابین تعلقات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے سنگھ نے بتایا کہ ''ہمارے گاؤں میں کسی طرح کی فرقہ ورانہ کشمکش نہیں تھی اور ہمارے خاندان کے لوگ ہر حال میں برداشت اور تحمل میں یقین رکھتے تھے۔ میری مسلمانوں سے بھی اچھی دوستیاں تھیں، اور مجھے ان میں سے ایک کا نام بھی یاد ہے، اور وہ تھا بشیر۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کے گھر بلا روک ٹوک آ جا سکتا تھا اور اسی طرح میرے گھر والوں کو بھی اس کے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔''

سنگھ نے ایک اور دلچسپ انکشاف بھی کیا:

''دوسرے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے میل جول رکھنا ایک مسئلہ تھا کیونکہ مسلمان ''حلال'' گوشت کھاتے تھے جبکہ غیر مسلم ''جھٹکا'' گوشت کھاتے تھے۔ ہمارے اسی طرح کا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ ہم سب سبزی خور تھے۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے 1954ء میں گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔''

اس حوالے سے کہ اس کے خاندان کو تقسیم کے متعلق کیسے خبر ہوئی تھی اور وہ کس طرح بچ کر نکل گئے تھے، سنگھ نے اپنی داستان سناتے ہوئے بتایا کہ،

''اوکاڑہ میں 20 اگست کے قریب فسادات پھوٹ پڑے، دوسرے علاقوں کی نسبت ذرا تاخیر سے۔ جس دن فسادات کی صورتحال بگڑنے کی خبریں نشر ہو رہی تھیں، اس دِن ہمارا ریڈیو

خراب ہوگیا اور ہمیں کسی طرح بھی حالات قابو سے باہر ہونے کی اطلاعات نہیں مل سکتیں۔ ایک مکینک کی دوکان کی طرف بڑھتے ہوئے میری ملاقات اپنے والد صاحب کے ایک ملازم افضل سے ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ یہ ملاقات کسی کارخانے کے قریب ہوئی تھی جس کا نام تھا 'کسان گھی'۔ اُس نے ہمیں فوراً گھر واپس جانے کا کہا اور ساتھ ہی ہمارے سارے خاندان کو تحفظ دینے کی پیش کش کردی۔ پھر اُسی رات اُنہوں نے ہم سب کو بُرقعے پہنا کر گوردوارہ سنگھ صاحب تک پہنچادیا جہاں ہم نے ایک ہفتہ قیام کیا۔ اگست کے تقریباً آخری ہفتے میں نے اوکاڑہ سے فیروز پور جانے والی ٹرین لی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ یہ ٹرین لاہور، رائے ونڈ اور قصور پر رُکی تھی۔ میرے خاندان والے ایک قافلے کے ساتھ پیدل فیروز پور روانہ ہوگئے۔ آخرکار ہم لوگ فاضلکا پہنچ کر پھر سے اِکٹھے ہوگئے۔

دہلی میں تقسیم کے بعد کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے سنگھ نے بتایا کہ ''مغربی پنجاب سے بے شمار دوسرے مہاجرین کی طرح دہلی میں ہمیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہمارے پاس کوئی مناسب مکان ہی نہیں تھا، نئی سڑک پر ایک 'کچا مکان' تھا اور اس کے بعد میں راجیند رانگر مُنتقل ہوگیا، جو کہ مہاجروں کا ہی علاقہ تھا۔ چند برس قبل میں اپنی موجودہ رہائش گاہ پنجابی باغ (ایک اور مہاجر علاقہ) میں منتقل ہوگیا۔ ہمارے خاندان اور چند ایک مسلمان دوستوں کے درمیان کچھ عرصہ خط و کتابت ہوتی رہی مگر پھر یہ رابطہ ختم ہوگیا۔''

جب اُس سے پوچھا گیا کہ آیا اُسے پاکستان آنے کی کوئی خواہش ہے تو اس کے الفاظ کچھ یوں تھے، ''مجھے پاکستان کا دورہ کرنے کی بہت شدید خواہش ہے، مگر ایسا اس لئے نہ کرسکا کیونکہ اگر ایک مرتبہ اس ملک کا ویزہ لگ گیا تو پھر امریکہ کا ویزہ حاصل کرنے میں مجھے مُشکلات پیش آسکتی ہیں۔''

## رگھوویندر اتنوار: تقسیم کی تاریخ اس کے لئے ایک فطری واقعے کی طرح ہے

53 سالہ رگھوویندر اجو کہ ایک معروف تاریخ دان بھی ہے، برصغیر کی تقسیم پر خصوصی ماہر کی حیثیت رکھتا ہے اور کرکشیترا، بربانہ کا رہنے والا ہے۔ اگرچہ اُس کی پیدائش تقسیم کے بعد ہوئی تھی مگر وہ یہ کہانیاں سُن سُن کر جوان ہوا ہے کہ اس کے دادا جان نے کس طرح کرک شترا کے ایک گاؤں لکھی سے جہاں ہندو اور مسلمان کئی برسوں تک بغیر کسی اختلاف کے اکٹھے رہتے رہے تھے،

مسلمان کے ایک گروہ کو بھاگ نکلنے میں مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بیوی کے ماں باپ کا تعلق بھی مغربی پنجاب سے تھا اور وہ لوگ معاشرے کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تقسیم ایک مستقل قسم کی چیز ثابت ہوگی۔ درحقیقت تقسیم کے دوران اُس کے ساس منالی میں چھٹیوں سے لُطف اندوز ہورہی تھی۔ اس کے مطالعے کا اہم شعبہ تقسیم ہے اور اُس نے اس موضوع پر کچھ مشہور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

اپنے گاؤں لکھی کے جو کہ کرک شترا کے قریب واقع ہے جہاں کہ دیہات کے راجپوتوں نے مسلمانوں کو بچایا تھا جغرافیائی محل وقوع اور سماجی ڈھانچے کا مختصر پس منظر بتاتے ہوئے رگھوویندرانا تھ یوں گویا ہوتا ہے،

''لکھی کرک شترا سے تقریباً 15 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کا شمار علاقے کے قدیم ترین دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تاریخی جڑیں یقیناً 1000 عیسوی تک جاملتی ہیں جب دہلی سے طومار سلسلۂ بادشاہت کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔ یہ گاؤں صدیوں تک راجپوتوں اور مسلمان باشندوں کے مابین قریبی روابط کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ تاریخی طور پر مسلمان راجپوتوں اور ہندو راجپوتوں کے مابین ملک کے اس حصے میں بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔''(29)

تنوار کی پیدائش تقسیم کے بعد کی ہے اور اس کی اپنی صورتحال بھی مابعد یادداشت کے عنصر کی فعالیت کی ایک جامع مثال ہے: درحقیقت وہ خود اپنی کتاب میں رقمطراز ہے کہ(30):

''برسہابرس سے میں اپنے دیہات کے بڑے بوڑھوں سے یہ قصے سُنتا چلا آرہا ہوں کہ مسلمان خاندانوں نے کس طرح دیہات چھوڑنے سے انکار کردیا تھا اور دیہات کے دیگر باشندے، خاص طور پر راجپوت قوم کے افراد بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے نہ جائیں۔''

اس سارے قصے کو بیان کرتے ہوئے جس کے مطابق اس کے دادا ٹھاکر حکم سنگھ اور اس کے والد ٹھاکر پرتھوی سنگھ مسلمانوں کے بچاؤ کیلئے کی جانے والی کوششوں کا حصہ تھے، تنوار کہتا ہے کہ ''ان کے گاؤں کو کرک شترا کے مہاجر کیمپ اور تھانسیر آنے والے لوگوں (غیر مسلم جو مغربی پنجاب سے آئے تھے) نے گھیر لیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان خاندانوں کو ان کے حوالے کردیا جائے۔ ایک دن سے بھی زیادہ وقت تک گاؤں کے راجپوت خاندانوں (بشمول میرے اپنے

خاندان) نے اُن خاندانوں کو اپنی حفاظت میں لئے رکھا اور اس امر کو بھی یقینی بنائے رکھا کہ مسلمان خاندانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ پائے۔'' (31)

وہ مزید کہتا ہے: (32)

''جب فوج کا ایک خصوصی دستہ ان خاندانوں کو بحفاظت لے جانے کے لیے آیا تو 50 کے قریب راجپوت ان کے ساتھ ہولئے تاکہ اُنہیں اس بڑے مسلمان قافلے تک پہنچادیا جائے جو اس راجپورہ کے قریب سے گزر رہا تھا اور یوں وہ بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔''

تنوار مزید بتاتا ہے کہ چونکہ تقریباً 200 مسلمان وہاں سے روانہ ہورہے تھے اسی لیے بڑی مقدار میں کھانا تیار کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دو بیل گاڑیوں کا تحفہ بھی انہیں دیا گیا جن میں بیلوں کی بہترین جوڑی لگادی گئی تھی تاکہ وہ اس میں اپنے ساتھ کھانا لے جاسکیں۔

اگرچہ تنوار کے دلا اجی نے مسلمانوں کو وہاں سے بحفاظت روانہ ہونے میں مدد دی تھی، مگر اس نے جس خاندان میں شادی کی تھی وہ پاکستان سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اس کے سُسر ڈاکٹر پی این آنند اور ساس سوار آنند دونوں پاکستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اُس کے سُسر جی لاہور میں میڈیکل کے طالب علم تھے اور اس غیر یقینی کیفیت کے ساتھ کہ وہ لاہور واپس بھی آسکیں گے یا نہیں وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ امرتسر روانہ ہوگئے تھے۔ وہ اتنی جلدی میں روانہ ہوئے تھے کہ اپنی کتابیں اور کلاس نوٹس بھی ساتھ نہ لے جاسکے۔ اس کی ساس کا تعلق خانیوال سے تھا اور اُنہوں نے اور اُن کے خاندان والوں کا خیال یہی تھا کہ وہ واپس اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔ (33)

تنوار نے یہ بھی بتایا کہ، ''میرے والد صاحب کے بہت سے دوستوں کا مجھ سے رابطہ برقرار رہا تھا۔ میرے والد صاحب تقریباً 20 برس قبل وفات پاگئے تھے اور یہ روابط اب قدرتی طور پر برقرار نہیں رہے۔''

تنوار کو تقسیم کے موضوع سے گہری دلچسپی ہے اور اُس نے اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھ ڈالی ہیں جن میں سے ایک ''رپورٹنگ دا پارٹیشن آف پنجاب'' بھی ہے۔ تقسیم پر ایک مانے ہوئے محقق کی حیثیت سے اس کے سرحد کے اس پار بہت سے افراد سے روابط بھی رہے ہیں۔ اس

کے علاوہ اُس کے معروف پاکستانی دانش وروں اور محققین مثلاً پروفیسر عمران علی اور پروفیسر طاہر کامران جیسے افراد سے بھی روابط رہے ہیں۔

پاکستان میں اپنے دوسرے روابط کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اُس نے کرک شترا کا دورہ کرنے والے ایک پاکستانی وفد کا ذکر بھی کیا: ''تقریباً تین برس قبل ہم نے پاکستان سے آنے والے سیاستدانوں اور صحافیوں کے ایک بہت بڑے وفد کا استقبال کیا تھا، جن میں سے اکثریت نے کرک شترا کے اردگرد واقع دیہاتوں کا دورہ کرنے کے دوران اپنی پُرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بہت حسرتناک جذبات کا اظہار کیا۔''

## بھاپا پریتم سنگھ: جس کو انسانی اقدار ہر دلعزیز تھیں

بھاپا پریتم سنگھ (پنجاب میں بڑے بھائی کو ''بھاپا'' کہا جاتا ہے) کی مثال جو کہ ایک معروف پنجابی ناشر تھا اور 1914ء میں مغربی پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں نارووال کے ایک گاؤں تلوانڈی بھنڈراں میں پیدا ہونے کے بعد مارچ 2005 میں نیو دہلی میں وفات پا گیا تھا، بہت سی وجوہات کی بناء پر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی بیٹی ڈاکٹر رینکا سنگھ نے جو کہ ایک لکھاری اور محقق بھی ہے اس کی زندگی کے حوالے سے بعض دلچسپ انکشافات کئے ہیں۔

تقسیم سے پہلے پریتم سنگھ پریت نگر نامی گاؤں میں جس کا مطلب ''محبت اور دوستی کی بستی'' ہے، سکونت پذیر تھا۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان واقع پریت نگر واہگہ بارڈر کے اُس پار انڈیا کی سرحد میں آباد تھا۔ تقسیم کے دوران بھاپا پریتم سنگھ نے نہ صرف اپنے گاؤں میں بلکہ ہمسایہ دیہاتوں میں بھی بہت سے مسلمانوں کی زندگی بچائی تھی۔ تقسیم کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گیا اور حسن اتفاق کہیں یا قدرت کی ستم ظریفی کہ اُسے وہاں مہرالی نامی علاقے میں ایک مسلمان کا خالی کیا ہوا گھر فراہم کیا گیا تھا۔ بعدازاں اسے جنوبی دِلی میں حوض خاص نامی علاقے میں مکان فراہم کر دیا گیا۔ پریتم سنگھ نے نولوگ پبلشرز کے نام سے ایک اشاعتی اِدارہ قائم کر لیا تھا۔ اس اشاعتی اِدارے کی طرف سے سرحد کے دونوں طرف پنجابی لکھاریوں کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ تاہم پاکستان کا دورہ کرنے کی اس کی خواہش کبھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔

اس سے قبل کہ تقسیم کے دوران پریتم سنگھ کی طرف سے لوگوں کی زندگیاں بچانے کی

کوششوں کا ذکر کیا جائے پریت نگر کی روایات واقدار کے پس منظر کا بیان کافی مفید رہے گا کیونکہ یہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں مذہبی تفریقات کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا تھا۔ یہاں بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے بے شمار لکھاریوں اور شاعروں نے سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ یہ بات بالکل درست طور پر کی گئی ہے کہ:

''مسٹر گریاکش سنگھ نے ایک ایسا شہر آباد کیا تھا جو کہ لاہور اور امرتسر دونوں سے برابر کے فاصلے پر تھا۔ گرباکش سنگھ پریٹ ری نے اپنی ذات کی کشش کو استعمال میں لاتے ہوئے بہت سی مشہور شخصیات مثلاً بھیشم ساہنی، بلراج ساہنی، نانک سنگھ، معروف فنکار شوباسنگھ اور بنگلہ دیش کی جنگ کے مشہور کردار لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے والد کے علاوہ فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، اوپندر ناتھ اشک اور کرتار سنگھ دگل ڈرامہ نویس بلونت گارگی، شاعر موہن سنگھ، ساحر لدھیانوی اور امرتا پریتم جو کہ اپنے عہد کی بہترین تخلیقی شخصیات تھیں، کو پریت نگر کی جانب کھینچ لانے اور اس سے منسوب کرنے میں کامیاب حاصل کر لی۔''

اپنے والد صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر رنیکا سنگھ نے پرجوش انداز میں بتایا کہ پریت نگر میں کسی طرح کی مذہبی تفریق نہیں پائی جاتی تھی جو کہ وسیع ظرف لوگوں کا شہر تھا۔ اس کے والد صاحب کے بہت سے دوست اور ملازم مسلمان تھے۔ تقسیم سے قبل کے دیگر قصبوں/دیہاتوں کے برعکس وہاں کسی طرح کی تفریقات یا اختلافات کا کوئی وجود نہیں تھا اور مسلمان وغیر مسلمان دونوں مل کر کھانے پیتے تھے۔ یہاں بائیں بازو کے ترقی پسندانہ غالب تھے نہ کہ روایتی مذہبی اقدار و روایات جو کہ پریت نگر کے باسیوں میں اتفاق اور یگانگت کا باعث تھی۔

تقسیم کے دوران اس کے والد صاحب نے اپنے ملازمین کی طرح کے مسلمان رہائشیوں کو وہاں سے بچ نکلنے میں مدد دیتے ہوئے خود اپنی زندگی بھی خطرے مین ڈالنے سے گریز نہ کیا۔ وہ قریب کے دیہاتوں میں بھی گئے اور وہاں سے بھی مسلمانوں کو بھاگ نکلنے میں مدد فراہم کی۔ ایک واقع کا ذکر کرتے ہوئے، جو کہ اس کی والدہ اکثر سُنایا کرتی تھیں، ڈاکٹر سنگھ یوں گویا ہوئیں:

''ایک موقع پر میری والدہ میرے والد صاحب کے لاپتہ ہو جانے پر بہت پریشان تھیں۔ اُنہوں نے ان کی تلاش میں پورا گاؤں چھان مارا مگر وہ نہ ملے۔ والد صاحب نے دراصل

پریت نگر کے نواح میں واقع دیہاتوں کے مسلمانوں کی زندگیاں بچانے کے لئے خود اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ ان کی کوششوں سے بہت سے لوگوں کی جانیں بچالی گئیں اور ان مسلمانوں کو اپنے نئے وطن پاکستان کی طرف بچ نکل جانے میں آسانی رہی۔

1948ء کے لگ سنگھ صاحب دہلی مُنتقل ہوگئے اور وہاں اُنہیں مہرالی میں ایک مسلمان کا چھوڑا ہوا مکان اور چاندنی چوک میں دو عدد دکانیں فراہم کر دی گئیں۔

اپنے اشاعتی اِدارے اور اس کے ساتھ ہی رسالے ''آرسی'' کے ذریعے بھاپھا پریتم سنگھ کا مغربی پنجاب کے لکھاریوں کے ساتھ رابطہ برقرار رہا۔ پنجابی ادب پر کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اُنہوں نے خوشونت سنگھ کی دو مطبوعہ جلدوں ''ہسٹری اینڈ ریلیجن آف دی سکھس (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) کا پنجابی میں اختصار بھی شائع کیا۔ (36)

اس کی بیٹی کا کہنا ہے کہ پریتم سنگھ کی طرف سے پاکستان کا دورہ کرنے کی خواہش پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی اگرچہ پاکستانی پنجابی لکھاریوں کے ساتھ ان کے قریبی روابط تھے۔

اُمید، یقین، دوستی اور اعتماد کی بہت سی ایسی کہانیاں ہیں جو سرحدوں اور عقائد سے ماورا تھیں۔ ہم نے یہاں صرف چند ایک ایسے دلچسپ تجربات کا انتخاب کر کے انہیں مخصوص رنگ میں پیش کیا ہے جو 1947ء کے فسادات کے دوران پیش آئے۔ ان اتفاقات یا ناگہانی واقعات کو نئے انداز میں اُجاگر کرنے کی کوشش ہے۔ اس طرح کی اور بھی بے شمار کہانیاں ایسی ہوں گی جو منظرِ عام پر آنے کی مُنتظر ہیں۔

# حوالہ جات


1۔ مہاجرین اپنے نقصانات کے ازالے یا بدلہ چکانے کے لیے بے تاب تھے اور متشدد انتقامی کاروائیاں تقسیم کے دوران عام تھیں۔

2۔ میاں میر ایک صوفی درویش جن کا تمام پنجابی اور سکھ احترام کرتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے گولڈن ٹمپل کی بنیاد رکھی تھی۔

3۔ یاسمین خان ''دی گریٹ پارٹیشن: دی میکنگ آف انڈیا اینڈ پاکستان'' 2007، صفحہ نمبر 197

4۔ چوہدری محمد اشرف سے انٹرویو

5۔ اے ایس ڈھلون، ''ری مینسنز آف پارٹیشن ڈیز: این ایگزامپل آف اورل ہسٹری اِن ایکشن'' کے عنوان سے لکھا جانے والا یہ مقالہ پٹیالہ میں مارچ 2003 میں ہونے والی پنجاب ہسٹری کانفرنس کے 35 ویں اجلاس میں پیش کیا گیا۔ صفحہ نمبر 13 تا 14

6۔ اسی کتاب/مقالے میں دیکھیے صفحہ نمبر 14

7۔ اسی کتاب/مقالے میں

8۔ اسی کتاب/مقالے میں دیکھیے صفحات 15 تا 18

9۔ اردمان سنگھ ڈھلون سے انٹرویو

10۔ دیکھیے راجندر سچر کی تحریر "The Hinduism, I Know" انڈین ایکسپریس، 23 جنوری 2008ء

11۔ دیکھیے پینڈرل مون کی {Divide and quit" صفحہ نمبر 126، ''دی پارٹیشن اومنی بس'' کتاب میں، 2007ء

12۔ دی انڈین ایکسپریس ''پنجاب مائیگرنٹس سٹیک کلیم آن دہلی ہاؤس'' 10 فروری 1998ء ،نرویا مادت۔

13۔ دیکھیے جی ڈی کھوسلا؟) کی تحریر ''سٹرن ریکننگ''، ''پارٹیشن اومنی بس'' کتاب میں صفحہ نمبر 199 پر

14۔ دیکھئے پرکاش ٹنڈن کی ''پنجابی ساگا''، 2000، صفحہ نمبر 218

14۔ دیکھئے پرکاش ٹنڈن کی ''پنجابی ساگا''، 2000، صفحہ نمبر 218

15۔ حوالے کے لئے دیکھئے ''لاہور 1947'' 2001 مرتب کردہ احمد سلیم، صفحہ نمبر 99

16۔ چوہدری محمد اشرف کا انٹرویو۔

17۔ دی ٹریبون ''دی سٹیمپ آف سرگودھا از ویزیبل ایوری ویئر''، 3 جولائی 2002

18۔ دیکھئے کبیر، اے ''میوزیکل ری کال: پوسٹ ممبوری اینڈ دی پنجابی ڈایا سپورا'' الف: جرنل آف کمپریٹو پوئٹکس، 1 جنوری 2004، ماخذ:

http://goliath.ecnext.com/coms2/Summary-0199-3537769-ITM.

19۔ میانی، ٹی ایس ''ساؤتھ ایشن کوآپریشن اینڈ دی رول آف دی پنجاب''، 2007، صفحات 85 تا 86 اور 123 تا 125

20۔ 3 ڈی کھوسلہ ''سٹرن ریکننگ'' کے عنوان سے تحریر ''پارٹیشن اومنی بس''، 2007 میں صفحہ 144 پر

21۔ دیکھئے متذکرہ بالا میں صفحا تا 228 تا 229 پر

22۔ دی انڈین ایکسپریس ''اے ویلیج انوائٹس انٹرفینس سن ہوم'' 20 فروری 1999 از ستندر بینز۔

23۔ دی انڈین ایکسپریس ''جاتی عمرہ ویلیجرز وریڈ اوور نواز شریف آؤسٹر''، 14 اکتوبر 1994، از ستیندر بینز

24۔ دی ٹریبون ''پرئیر فار پیس ایٹ شریفز ویلیج''، 15 جون 1999، از وریندر والیا

25۔ دی ٹریبون ''سیلیبریشن ٹائمز ایٹ شریفز، نیٹو ویلیج''۔ 20 فروری 2008 از وریندر والیا وگوز بخش پوری

26۔ دی ٹریبون ''وی عل ایٹ اوکاڑا'' 29 جولائی 2003ء

27۔ دیکھئے اسی مضمون میں

28۔ رگھوویندرا تنوار کا انٹرویو

29۔ رگھوویندرا تنوار کا انٹرویو، حوالے کے لئے دیکھئے اس کی کتاب ''ریورٹنگ دی پارٹیشن

آف پنجاب'' 2006، صفحات 563 تا 564

30۔ دیکھئے اسی کتاب میں صفحہ 564

31۔ دیکھئے اسی کتاب میں

32۔ رگھوویندرا تنوار کا انٹرویو اور رگھوویندرا تنوار کی کتاب ''رپورٹنگ دا پارٹیشن آف دی پنجاب'' 2006 صفحہ نمبر 24

33۔ دی ٹریبون ''پریت نگر ڈریم ڈائزاے پین فُل ڈیتھ'' 17 فروری 2005، ازوریندروالیا

34۔ دیکھیے اسی مضمون میں

35۔ دی ٹریبون ''لوایبل پریتم سنگھ'' 28 مئی، 2005ء، خوشونت سنگھ

# پاکستان کے تجربات

واہگہ بارڈر کی دوسری جانب سے ہم نے کل گیارہ عدد کہانیاں اکٹھی کیں۔ان کہانیوں کو موضوعات کی مناسبت سے ترتیب دیا گیا ہے۔

فہمیدہ بانو: مددگار (سامریہ باشندے) کی بیوی اور امن پسند کی ماں

90 برس کی فہمیدہ بانو ایک سے زیادہ وجوہات کی بناء پر اہمیت رکھتی ہے۔اس کا خاندان امرتسر میں رہائش پذیر تھا، یہ سکھوں کی اکثریت کا علاقہ تھا جہاں زیادہ تر بلوائی سکھ ہی تھے۔اس کے باوجود خونی فسادات کے دوران محمد یٰسین (فہمیدہ کے خاوند) نے اپنے ایک سکھ دوست کی بیٹیوں کی، جو کہ فسادات کے دوران خود ملک سے باہر تھا، حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ جب فسادات شروع ہوئے تو محمد یٰسین کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا اور نوجوان سکھ لڑکیوں کو بھی ساتھ ہی لیتا گیا۔یٰسین نے ان لڑکیوں کو اکتوبر 1947ء میں جبکہ حالات بہتر ہو چکے تھے ان کے خاندان کے ساتھ دوبارہ ملوا دیا۔اس عرصے کے دوران لوگ کسی بھی اور فرقے کے افراد کو اپنے ساتھ رکھنے میں خوف محسوس کرتے تھے۔نوجوان سکھ لڑکیوں کو لاہور میں پناہ دینا ایک بہت ہی جُرأت والا کام تھا اور بہت سے مسلمان، خاص طور پر جو کہ مشرقی پنجاب میں صعوبتیں اُٹھا چکے تھے، سکھوں کے لئے نہایت مخاصمانہ جذبات رکھتے تھے اس کے علاوہ اس واقعے سے عزت و غیرت کا ''مُثبت'' پہلو بھی سامنے آتا ہے کیونکہ فہمیدہ بانو کے خاوند نے ان لڑکیوں کو محفوظ رکھنے کا اپنا وعدہ پورا کرنے کے ساتھ ہی حالات بہتر ہونے پر انہیں واپس ان کے خاندان کے سُپرد کر دیا تھا۔ آخری نکتہ یہ کہ اس کا بیٹا اویس شیخ جو کہ غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوا تھا نہ صرف یہ کہ اس کے گھر کا دورہ کر آیا ہے بلکہ دونوں ممالک کے درمیان امن کا بہت بڑا علمبردار بھی ہے۔

فہمیدہ بانو کا خاوند محمد یٰسین برطانوی ہندوستان کی والی بال ٹیم کا نائب کپتان تھا۔ تقسیم سے پہلے فہمیدہ اور اس کا خاندان محلّہ پریم نگر، تحصیل پورہ امرتسر میں رہتے تھے۔ مسلمان، ہندو اور سکھ آپس میں مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے جیسا کہ پنجاب کے دوسرے قصبوں/شہروں میں معمول تھا۔

اپنے خاوند کی طرف سے سکھ دوست کی بیٹیوں کو بچانے کا مکمل واقعہ بیان کرتے ہوئے، فہمیدہ نے بتایا کہ ''میرے خاوند کا ایک سکھ دوست جو کہ انڈین والی بال ٹیم کا رُکن تھا ہمارے ہمسائے میں رہتا تھا۔ جس وقت فسادات شروع ہوئے تو وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امرتسر میں صورتحال بہت زیادہ بگڑنے لگ گئی تو میرے خاوند کے دوست نے اسے ٹیلی فون کیا اور درخواست کی کہ وہ اس کی بیٹیوں کا خیال رکھے۔ یٰسین نے اسے یقین دہانی کروائی کہ وہ دونوں لڑکیوں کا خیال رکھے گا۔ وہ فوراً ہی اپنے سکھ دوست کے گھر گیا اور دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے آیا۔''

بعدازاں، جب حالات بدتر ہو گئے تو شیخ محمد یٰسین اور اس کے والدین نے فیصلہ کیا کہ ہم لوگ لاہور مُنتقل ہو جائیں۔ یٰسین اپنی والدہ، بیوی (فہمیدہ)، اپنے ایک سالہ بچے اویس اور اپنے سکھ دوست کی دو بیٹیوں کے ساتھ مہاجرین کی ایک ٹرین پر سوار ہو کر واہگہ بارڈر پہنچ گیا۔ وہ ٹرین کے سفر کے دوران فسادات کی زد میں آنے سے اس لئے بچ گئے کیونکہ اس ٹرین کی حفاظت پر فوج کو مامور کیا گیا تھا۔

فہمیدہ نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ اس کے خاوند نے اُس وقت اپنے دوست کی دونوں جوان بیٹیوں کو جبکہ ان کا باپ بھی ان کے ساتھ نہیں تھا روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ کیوں رکھا تھا۔ فہمیدہ بانو کے بقول:

''ہمارا یہی خیال تھا کہ ان جوان لڑکیوں کو اکیلا چھوڑ کے چلا جانا مناسب نہیں ہے۔ ہم انہیں اپنے خاندان کے افراد کی حیثیت سے ہی اپنے ساتھ لے گئے تھے، یعنی اپنے بچے سمجھ کر چنانچہ ہم سب اِکٹھے ہی پاکستان آ گئے۔ تاہم لاہور کی طرف جاتے ہوئے ہم نے ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ بہت سی لاشیں بھی بکھری ہوئی دیکھیں۔ آخر کار ہم لوگ لاہور پہنچ گئے اور ان سکھ لڑکیوں نے ہمارے ساتھ دو ماہ قیام کیا۔ اکتوبر 1947ء میں جب قتل و غارت اور

تشدد کی لہر ذرا کم ہوئی تو میرا خاوند ان دولڑکیوں کے ساتھ واپس انڈیا چلا گیا اور یوں ان بچیوں کو بغیر کسی تکلیف کے ان کے باپ کے ساتھ ملوادیا گیا۔ وہ اپنے مخلص مسلمان دوست کا بہت ہی شکر گزار تھا۔''

اویس شیخ جو کہ فہمیدہ بانو اور محمد یٰسین کا بیٹا ہے، خوش قسمتی سے امرتسر میں اپنے پُرانے گھر کا دورہ کر آیا ہے اور اس وقت ''پاک انڈیا پیس اِنی شی ایٹو'' کے نام سے ایک این جی او چلا رہا ہے جو کہ خطے میں امن کے فروغ کے لئے بہت سخت جدّ وجہد کر رہی ہے۔

حقیقت میں اس نے برصغیر میں امن کے میدان میں پیش قدمی کے حوالے سے چند بہت ہی مُثبت قسم کی کوششیں کی ہیں۔ جب اس سے ان کوششوں کے حوالے سے پوچھا گیا تو شیخ نے جو کہ انڈو پاک امن کوششوں کے حوالے سے سمجھوتہ ایکسپریس کے عنوان سے ایک کتاب بھی تحریر کر چکا ہے، ان خیالات کا اظہار کیا:

''پاک انڈیا پیپلز فورم فار پیس اینڈ ڈیما کریسی کی تشکیل دونوں ممالک میں کی گئی تھی اور عوام کا عوام سے پہلا براہ راست رابطہ 1995ء میں عمل میں آیا۔ خوش قسمتی سے میں پی آئی پی ایف پی ڈی کے بانی ارکان میں سے ہوں۔ پہلا مُشترکہ اجلاس دہلی میں ہوا تھا جہاں دونوں اطراف سے سوسو لوگوں نے شرکت کی۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ قراردادیں مشترکہ طور پر پاس کی گئی تھیں جن میں دونوں ممالک کی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ تصادم وغیرہ سے گریز کریں اور رواں تنازعات کو میز پر بیٹھ کر مذاکرات کے ذریعے حل کریں۔ یہ دونوں ممالک کی حکومتوں کو بھجوایا جانے والا ایک بہت ہی موثر پیغام تھا۔

1997ء میں پاکستان 14 اگست کو اپنا پچاسواں یومِ آزادی منا رہا تھا۔ جب انڈیا میں بھی 15 اگست کو یہی کام کیا گیا۔ میں پاک انڈیا پیس اِنی شی ایٹو (Pak India Peace Initiative) کا صدر تھا۔ ہم نے دونوں اطراف سے سوسو بندوں کو مدّعو کیا تھا۔ ہمارے انتظامات ہر لحاظ سے زبردست اور بہترین تھے مگر دونوں ممالک کے بااثر حلقوں اور بیوروکریسی نے ہمارا پروگرام ناکام بنا کر رکھ دیا۔ انڈین وفد کے سوارکان کے ویزے پاکستان کی طرف سے عین موقع پر روک دیئے گئے اور اس کے نتیجے کے طور پر انڈیا نے بھی کسی قسم کا ویزہ جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم 13 اگست کو انڈیا نے ہمارے وفد کے 12 فی صد ارکان کو ویزہ جاری

کر دیا تا کہ ہم امرتسر پہنچ کر گولڈن جوبلیکی تقریبات میں شرکت کر سکیں ۔اندرونی اور بیرونی قوتوں کی طرف سے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود میں وفد کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گیا۔امرتسر میں ایک سیمینار بھی تھا جس میں صنعت کاروں، دانشوروں ،صحافیوں، سماجی اور سیاسی کارکنوں وطلباء نے پورے انڈیا سے آ کر شرکت کی۔اس کے علاوہ جنوبی ایشیائی ممالک کے بعض نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔'''

شیخ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:

''2001اور 2003 کے درمیان دونوں ممالک کے درمیان کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔تاہم 2003ء کے بعد میں نے کئی بار انڈیا کا دورہ کیا اور میری کتاب سمجھوتہ ایکسپریس 2003ء میں دہلی میں سے شائع ہو کر بازار میں آ گئی۔اس وقت سے لے کر اب تک میں نے کئی مرتبہ انڈیا کا دورہ کیا ہے اور لاہور میں بھی سیمینارز اور امن کانفرنسیں کروا چکا ہوں۔''

ہندی ایڈیشن سمجھوتہ ایکسپریس کا اجراء 2008ء میں سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال کے ہاتھوں ہوا تھا۔

تاج بی بی: جو ایک سکھ زمیندار اور عیسائی مشینری ادارے کی احسان مند ہے۔

87 سالہ تاج بی بی فیصل آباد (جو اس سے قبل لائل پور کہلاتا تھا) میں سکونت پذیر ہے۔ تقسیم کے وقت اُس کی عمر 27 برس تھی اور اس کا خاندان مشرقی پنجاب میں رہائش پذیر تھا۔اسی کی مثال کا تذکرہ دو وجوہات کی بناء پر دلچسپ نظر آتا ہے۔پہلے تو یہ کہ اُسے ایک سکھ خاندان نے بچایا تھا جس نے اسے پناہ دینے کے ساتھ ہی اس امر کو بھی یقینی بنایا کہ وہ بحفاظت پاکستان پہنچ جائے۔دوسری وجہ یہ کہ اُس کی بیٹی کو جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ مر چکی ہے، ایک عیسائی پادری نے بچا کر پاکستانی فوج کے حوالے کر دیا تھا۔اور آخری بات یہ کہ اُس کے خاوند نور محمد کو جو کہ ایک سپاہی تھا اپنی بیٹی لاہور کے میو ہسپتال میں ملی تھی۔

اپنی داستان سناتے ہوئے تاج بی بی ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے کہنے لگی:

''تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات میں نے بہت سے سکھوں اور ہندوؤں کو ایک نئے قائم ہونے والے ملک پاکستان کی طرف ہجرت کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔اسی طرح میں نے مسلمانوں کو پاکستانی پنجاب سے ہجرت کر کے

انڈیا کے مشرقی پنجاب کی طرف ہجرت کرنے والے سکھوں پر حملہ کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اُس زمانے میں سرحد کے دونوں طرف، تاہم ابھی بھی کچھ ایسے لوگ باقی تھے جن کے نزدیک مذہب اور قوم پرستی سے بھی بڑھ کر انسانیت کا جذبہ اہم تھا۔ ان لوگوں نے انسانیت کے جذبے کے پیشِ نظر بہت سے معصوم افراد کی جانیں بچائیں۔ ایک مرتبہ میں اپنی چار برس کی بیٹی کو گود میں اُٹھائے فتح گڑھ چوریاں، ضلع امرتسر سے اپنے خاندان کے ساتھ لاہور پاکستان کی طرف ہجرت کر رہی تھی تو اس وقت راستے میں سکھوں کے ایک بے قابو ہجوم نے حملہ کر دیا۔ اُنہوں نے میرے زیورات چھیننے کی کوشش کی۔ اس حملے میں میری 3 برس کی بیٹی کو شدید چوٹیں آئیں۔ مجھے بھی تھوڑی بہت چوٹیں آئیں مگر میں کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ مین نے یہ سوچ کر کہ میری بیٹی مر چکی ہے اُسے پیٹ پر لگے ہوئے زخموں کے ساتھ کھیتوں میں چھوڑ دیا، کیونکہ اس کے جسم پر کافی چوٹیں آئیں تھیں۔ مگر خوش قسمتی سے اسے بعد میں ایک عیسائی پادری نے بچالیا تھا۔ جب میں ان ظالم لٹیروں کی یلغار سے بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئی تو میں نے خود کو گنے کے کھیتوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس دوران امرتسر کے ایک سکھ زمیندار نے جس کا تعلق شہر کے سنگھ پورہ کے علاقے سے تھا مجھے گنے کے کھیتوں میں دیکھ لیا۔ اس نے ایک خاتون کے طور پر مجھے نہ صرف تحفظ فراہم کیا بلکہ بہت عزت اور احترام کے ساتھ کئی ہفتے مجھے پناہ دیئے رکھی۔ مزید یہ کہ اس زمیندار خاندان نے بھی میرے ساتھ بہت نرمی اور شفقت کا سلوک کیا اس حقیقت کے باوجود کہ میں نہ تو سکھ تھی اور نہ ہی ان میں سے کوئی میرا شناسا تھا۔ اس ساری صورتحال کے باوجود ان لوگوں نے مجھے نفرت اور خوف کے ماحول میں خود اپنی زندگیوں کا خطرہ مول لے کر مجھے پناہ دی۔ چند ہفتوں کے بعد اُنہوں نے پاک فوج کی ایک رجمنٹ کے ساتھ رابطہ کیا جو کہ فسادات کے دوران گم ہو جانے والی خواتین کی تلاش کر رہی تھی۔ چنانچہ میں اس نرم دِل اور مہربان سکھ خاندان کی کوششوں کی بدولت فیصل آباد پہنچ گئی۔ میرے خاوند کو اصل میں ہماری کھوئی ہوئی۔ بیٹی بھی مل چکی تھی جسے کہ ایک عیسائی پادری نے زخمی حالت میں اُٹھالے جا کر اسے ابتدائی طبی امداد دلوائی تھی اور مرہم پٹی وغیرہ کے بعد پاک فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ میرے خاوند کو یہ اصل میں میو ہسپتال لاہور میں ملی تھی جہاں وہ فوج کے زیرِ نگرانی تھی۔''

ماضی کو کریدتے ہوئے وہ بولی: ''چھ عشرے گزر جانے کے بعد، مجھے ابھی تک اس نرم

دل اور انسان دوست سکھ خاندان کا شفیقانہ برتاؤ نہیں بھولا جنہوں نے کہ میری جان بچائی تھی۔ مزید یہ کہ میری بیٹی کی زندگی بھی ایک ایسے مہربان پادری نے بچائی تھی جسے اگرچہ یہ علم تھا کہ یہ مسلمان بچی ہے۔ مگر پھر بھی اس نے اس کی جان بچائی اور اسے پاکستانی فوج کے سپرد کر دیا۔ ہمارا خاندان ''غیر مسلم بھارتی باشندوں کی مہربانیوں کی بدولت دوبارہ اکٹھا ہو گیا تھا۔''

جب اُس سے یہ پوچھا گیا کہ آیا اُس نے کبھی انڈیا کا دورہ کیا ہے یا اُسے وہاں جانے کی خواہش ہے، تو وہ کہنے لگی، ''میں کبھی انڈیا کا دورہ تو نہیں کر سکی، مگر میری خواہش ہے نہ میں وہاں سے ہو آؤں اور اگر مجھے کوئی موقع ملا تو میں اپنے آبائی گاؤں جانا ضرور پسند کروں گی۔''

انڈیا اور پاکستان کے مابین تعلقات کے حوالے سے اظہار رائے کرتے ہوئے اس نے اپنے احساسات یوں بیان کئے ''سرحد کے دونوں اطراف رہنے والے عوام ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور امن وچین سے رہنا چاہتے ہیں۔ محض چند مفاد پرست عناصر اس خطے میں نفرت پروان چڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں اکثر اپنے گھر کے افراد کو یہی بتاتی رہتی ہوں کہ اس سکھ خاندان کی نرم دِلی اور مہربانی کو ہمیشہ یاد رکھیں جس نے میری جان بچائی تھی۔ میں اس خاندان کی بہت مشکور واحسان مند ہوں اور ان کی مہربانیوں اور فراخدلی کا بدلہ کبھی نہیں اُتار سکتی۔

## چٹال خان

چٹال خان جو کہ اب 70 برس کا بوڑھا کسان ہے اور کوٹ رادھا کشن مین سکونت پذیر ہے، اصل میں اترونانی دیہات سے تعلق رکھتا ہے جو کہ اب ہریانہ کی حدود میں واقع ہے۔ وہ اپنے خاندان سے بچھڑ گیا تھا مگر گاؤں کے ایک سکھ خاندان کی کوششوں سے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تاج بی بی کی طرح وہ بھی سکھ خاندان کی نیکیوں کو کبھی نہیں بھلا سکا۔ اس کی اپنے آبائی گاؤں پہنچنے کی خواہش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے انڈیا میں اپنے آبائی گاؤں کا دورہ کرنے کے لیے اپنے مویشی بھی فروخت کر دیئے تھے۔

تقسیم کے دوارن پیش آنے والے تجربات کو یاد کرتے ہوئے، چٹال خان کہتا ہے، ''تقسیم کے وقت میں اتفاق سے اپنے خاندان سے بچھڑ کر رہ گیا جو کہ پاکستان ہجرت کر گئے تھے،

بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ۔ چونکہ میں پیچھے اس گاؤں میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا جو کہ میرے پُرانے گاؤں کے قریب تھا، چنانچہ اس گاؤں میں رہنے والے سکھوں نے ہی مجھے پناہ دی کیونکہ وہ ایک معصوم اور بے بس بچے کو یوں اکیلا رہ جانے کے دُکھ اور تکلیف سے گزرتا نہیں دیکھ سکتے تھے ایک سکھ خاندان نے میرے والدین کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اُنہیں پتہ چلا کہ میں اپنے خاندان سے بچھڑ چکا ہوں۔ یہ سکھ خاندان میرے اوپر بہت مہربان تھا اور اُنہوں نے مجھے خوراک وغیرہ دینے کے ساتھ ہی میرے ساتھ ان دنوں بالکل اپنے بچوں کا سا سلوک کیا۔ اگرچہ وہ لوگ خود بھی غریب تھے مگر اُنہوں نے مجھے تحفظ فراہم کیا۔ چونکہ وہ میرے اُس دُکھ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو کہ مجھے اپنے والدین کی جُدائی کے نتیجے میں محسوس ہو رہا تھا لہٰذا اُنہوں نے میرے لئے ایک بیل گاڑی کا بندوبست کیا تا کہ مجھے انڈیا۔ پاکستان کی سرحد پر لے جائیں۔ ان کی وجہ سے ہی میں پاکستان داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مجھ پاکستانی حکام کی طرف سے ایک مہاجر کیمپ واقع والٹن روڈ لاہور لے جایا جایا گیا۔ خوش قسمتی سے پاکستانی حکومت نے میرے علاقے سے تعلق رکھنے والے تمام مہاجرین کو ایک ہی کیمپ میں پناہ دینے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اور یوں میرا پاکستان میں اپنے خاندان کے ساتھ دوبارہ ملاپ ہو گیا۔''

سکھ خاندان کی نوازشات کو یاد کرتے ہوئے خان صاحب نے بتایا کہ،''اب مجھے خیال آتا ہے اگرچہ اس واقعے کو 60 برس گزر چکے ہیں، کہ اگر میں اپنے خاندان سے بچھڑ جانے کے بعد کسی ویرانے میں مارا جا چکا ہوتا تو آج یوں اپنے خاندان کے ساتھ یوں خوشگوار زندگی نہ گزار رہا ہوتا۔ یہ اس غریب مگر انسان دوست و مہربان سکھ خاندان کی کوششوں کا نتیجہ ہی تھا کہ مجھے بچا لیا گیا اور یوں میں ایک خوشگوار زندگی گزارنے کے ساتھ ہی اس قابل بھی ہو گیا خود اپنے بیوی بچوں کی پرورش کر سکوں۔

اپنے انڈیا کے دورے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ''انڈیا سے ہجرت کر کے یہاں آ جانے کے بعد میں نے تقریباً 60 برس کے بعد اگست 2007ء میں انڈیا کا دورہ کیا۔ اگرچہ مجھے اُس سکھ خاندان کے افراد کے نام اور چہرے یاد نہیں رہے تھے جنہوں نے کوشش کر کے مجھے پاکستان بھجوا دیا تھا مگر میری یہ خواہش ضرور تھی کہ میں اپنے آبائی گاؤں اور اجداد کے گھر کو دیکھ آؤں۔ اس کے علاوہ میں اس مخصوص مقام کا دورہ بھی کرنا چاہتا تھا جہاں پر میں

فسادات کے دوران اپنے خاندان سے بچھڑ گیا تھا۔ مجھے یہ تو یاد نہیں ہے کہ اُس وقت کس نے میری جان بچائی تھی کیونکہ تقسیم کے وقت میری عمر دس برس بھی نہیں تھی، مگر میں اُسی جگہ پہنچ کر مجھے پناہ فراہم کرنے والے مہربان سکھ گھبرانے کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنی بھینس بیچ دینے کے بعد میں انڈیا پہنچ گیا۔ میری طرح کے کاشتکاروں اور دیہاتی باشندوں کے لئے مویشی زندگی کا اہم اثاثہ ہوتے ہیں مگر میں انڈیا جا کر اپنے محسنوں کے گھر کا دورہ کرنے کے لئے اس قدر بیتاب تھا کہ میں نے مالی مُشکلات کی بھی پرواہ نہیں کی اور اپنے منصوبے پر عمل پیرا رہا۔ میرا انڈیا کا دورہ دراصل دوبارہ اپنے بچپن میں لوٹ جانے کے مترادف تھا اور یہ ایک طرح سے اپنے محسنوں کو خراج تحسین پیش کرنے کا انداز بھی تھا۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ میں اُس خاندان کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ تاہم میں اس وقت وہاں رہنے والے لوگوں کے لئے اظہار تشکر کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی میں کچھ حد تک اُداس بھی ہوں کہ میں اپنے محسن خاندان کو تلاش کرنے اور ملنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

مزید برآں اب جبکہ ساٹھ برس گزر چکے ہیں تو اس کے بعد مجھے یہ موقع بھی نہ مل سکا کہ کوئی ایسا فرد مجھے مِل جائے جو میری کہانی یاد رکھ سکے۔ اس ساٹھ برسوں میں مجھے یہ موقع بھی نہ مل سکا کہ کوئی مجھے اپنے محسنوں یا ان کے بچوں سے ہی ملوا کر لے آتا۔ اس وقت میں کھو چکا تھا تو اب 1947ء میری زندگی بچانے والا خاندان کہیں کھو چکا ہے۔ اب میری بقایا زندگی اسی دُکھ کے ساتھ گزرے گی۔

ایک زیادہ مُثبت پہلو کا ذکر کرتے ہوئے چٹال خان نے کہا: ''اس کے برعکس میں اپنی جائے پیدائش اور اس جگہ کا دورہ کر کے خوش بھی تھا جہاں پر کہ میں اپنے خاندان سے بچھڑ گیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ خاندان بھی جس نے میری جان بچالی تھی۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس میں پورے ساٹھ برس بیت گئے تھے۔

## رانا امیر خان: امن کا سفیر

67 سالہ رانا امیر خان ان دنوں پاکستان میں اسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب کے عہدے پر فائز ہے۔ وہ موضع بھین، ضلع انبالہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی مثال بھی بہت دلچسپ ہے

کیونکہ اس کے خاندان کو گاؤں کے بعض سکھ باشندوں نے بچایا تھا اور سکھوں کی مُقدس درگاہ میں کچھ روز اُن کو پناہ بھی دیئے رکھی تھی۔ رانا امیر نے پاکستان سٹیزن کونسل کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی ہوئی ہے جس کا دوسرے مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان امن قائم کیا جائے۔

اپنے گاؤں کے تقسیم سے قبل کے ماحول پر گفتگو کرتے ہوئے رانا امیر خان کہتا ہے کہ،

''میں 1947ء کے سال میں گورنمنٹ پرائمری اسکول موضع بھین میں تعلیم حاصل کر رہا تھا جب جون 1947ء میں تین ماہ کے لئے اسکول کو گرمیوں کی چھٹیوں کے لئے بند کر دیا گیا۔ پرائمری اسکول میں ہندو اور سکھ بھی میری ہم جماعت تھے۔ میرے والد صاحب رانا بشیر احمد خان انبالہ میں ایک بنک کی ملازمت کر رہے تھے۔ میرے دادا ماسٹر محمد شفیع خان انبالہ میں مسلم ہائی اسکول کے ایک ریٹائرڈ ٹیچر تھے اور سکھوں و ہندوؤں دونوں فرقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ درحقیقت میرے دادا گاؤں کے ایک سماجی کارکن تھے حتیٰ کہ ہندو اور سکھ بھی ان سے خاندانی معاملات میں اور بعض اوقات تو شادی بیاہ تک کے مسائل میں بھی رہنمائی لیتے رہتے تھے۔ میرے والد صاحب راجپوت ہاسٹل میں بھی کام کرتے تھے جہاں راجپوت خاندان کے بچے زیر تعلیم تھے۔''

تقسیم کے دور کے بدقسمت واقعات کو یاد کرتے ہوئے رانا امیر خان نے یوں تبصرہ کیا:

''مسلمانوں نے ستمبر یا اکتوبر 1947ء کے لگ بھگ دیہات سے نقل مکانی شروع کر دی۔ جب حالات مزید بدتر ہو گئے تو ہمارے گاؤں میں رہنے والے مسلمانوں نے لاہور کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ دیہات میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ حتیٰ کہ اس دور میں بھی ہمارے گاؤں میں تمام سماجی اور مذہبی طبقات کے درمیان ہم آہنگی برقرار رہی اور سکھ و مسلمان پُر امن طریقے سے اکٹھے زندگی گزار رہے تھے۔ اس گاؤں میں اس قدر بھائی چارہ تھا کہ سکھوں کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان وہیں رہتے رہیں اور نقل مکانی نہ کریں۔''

بہت سی دیگر مثالوں کی طرح گاؤں کے مقامی لوگوں نے کسی طرح کی ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی بلکہ یہ دوسرے دیہاتوں کے شر پسند عناصر ہی تھے جو مصائب پیدا کر رہے تھے۔ رانا امیر کے بقول:

''مقامی لوگوں نے ہماری زندگیوں کے تحفظ کا وعدہ کیا ہوا تھا مگر دوسرے دیہاتوں سے تعلق رکھنے والے سکھ گروہوں نے کئی مرتبہ ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے کی کوشش کی تا کہ مسلمانوں کو ہلاک کر دیں مگر موقع بھین کے سکھوں نے ایسی تمام کوششیں ناکام بنا دیں۔''

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ یہ گوردوارہ ہی تھا جہاں رانا امیر کے گاؤں کے مسلمانوں کو پناہ دی جاتی رہی۔ رانا صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''مقامی سکھوں نے مجھے، میری والدہ، اور دیگر خواتین اور بچوں کو گوردوارے میں چھپا دیا اور کئی روز تک ہماری نگرانی کرتے رہے۔ تاہم بعدازاں جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو میرے دادا جی اور دوسرے مسلمانوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اپنے سکھ دوستوں کے تحفظ میں ہم لوگ انبالہ کے مہاجر کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں فوج کو مہاجرین کی نگرانی کا فریضہ سونپ دیا گیا تھا۔ فوج کے جوانوں کے تحفظ میں ہم بس کے ذریعے لاہور آ گئے۔'''

ان دنوں رانا امیر پاکستان سٹیزن کونسل کے نام سے ایک این جی او چلا رہا ہے۔ یہ تنظیم ڈاکٹروں، انجینئروں، کاروباری افراد، پروفیسروں، وکیلوں اور صحافیوں پر مُشتمل ہے۔ یہ مختلف مقاصد کے لئے کام کرتی ہے جن میں سے ایک اہم مقصد انڈیا اور پاکستان کے درمیان امن کے قیام کی کوششیں کرنا ہے۔ مارچ 2006ء میں پاکستان سٹیزن کونسل نے ایک سیمینار یعنی مذاکرے کا اہتمام کیا جس میں انڈیا سے وفود کو مدّعو کیا گیا تھا۔ اس مذاکرے کے دوران بہت سے اہم معاملات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی اُٹھایا گیا کہ دونوں ممالک کی مُشترکہ جُرات مند شخصیات، خاص طور پر، ٹیپو سلطان، بھگت سنگھ اور سر سید احمد خان کو تسلیم کیا جائے۔ مئی 2007ء میں سٹیزن کونسل نے ''مسلم صوفیاء اور بابا گورو نانک'' کے موضوع پر بھی ایک مذاکرے کا اہتمام کروا کر انڈیا سے ایک وفد کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔

رانا امیر خان نے تین بار انڈیا کا دورہ کیا ہے۔

## شوکت علی اعوان: ایک ہمدرد پولیس والے کا بیٹا

60 سالہ چیف میٹر بالوجسٹ شوکت علی اعوان برصغیر کی تقسیم کے ایک برس بعد 1948ء

میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا تعلق سرگودھا سے ہے اور اس کی آپ بیتی دو وجوہات سے دلچسپ ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کے والد صاحب نے غیر مسلموں کو بحفاظت مشرقی پنجاب پہنچ جانے میں مدد دی۔ دوسرے یہ کہ اعوان کو تقسیم کے 16 برس بعد سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ سے ملاقات کا موقع بھی میسر آیا تھا۔ اس ملاقات میں ماسٹر تارا سنگھ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور یہ جاننے کے بعد کہ اعوان کے والد صاحب نے غیر مسلموں کی جان بچائی تھی، اُنہیں گلے لگا لیا۔

اپنے والد صاحب اور ان کے فرائض کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، اعوان نے بتایا کہ ''تقسیم کے دنوں میں میرے والد ملک غضنفر اعوان یونائیٹڈ پنجاب گورنمنٹ کے محکمۂ پولیس میں سب انسپکٹر تھے، اس وقت ان کی عمر 32 برس تھی۔ 03 جون 1947ء کو حکومت کی طرف سے ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے بعد سارے پنجاب میں فسادات پھیل گئے اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر نے معصوم افراد کو لوٹنا اور ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ تقسیم سے قبل کے زمانے میں سرگودھا میں مسلمان، ہندو اور سکھ مل جُل کر ہم آہنگی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ میرے والد کو محکمۂ پولیس سے احکامات موصول ہوئے کہ امن و امان کی صورتحال کو قابو میں رکھنے کے انتظامات یقینی بنائے جائیں۔ مغربی پنجاب کے دوسرے علاقوں کی طرح بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے مدِ نظر سکھوں اور ہندوؤں نے یہاں سے بھی نقل مکانی شروع کر دی تھی۔ وہ مغربی پنجاب چھوڑ کر انڈیا میں مشرقی پنجاب جا رہے تھے۔''

اس دور میں سرگودھا کی مجموعی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے اعوان نے یوں تبصرہ کیا، ''مون سون کا موسم شروع ہو چکا تھا اور علاقہ موسلا دھار بارشوں کی زد میں تھا۔ مگر سکھ اور ہندو خاندان اس موسم میں بھی ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ بعض گھرانوں کے پاس چھتریاں موجود تھیں مگر اکثریت ان سے محروم تھی۔ وہ ایک تکلیف دہ اور اذیت ناک احساس کے ساتھ اپنے گھر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ وقت اور حالات دونوں ان کی موافقت میں نہیں تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ انڈیا میں اپنے نئے گھروں کی طرف روانہ ہوتے ہوئے جہاں کہ وہ اس سے قبل کبھی بھی نہیں رہے تھے مناسب انتظامات اور تحفظ کے احساس سے بالکل محروم نظر آ رہے تھے۔''

اُن لوگوں کی حالتِ زار پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس نے کہا، ''آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان خاندانوں کو کتنی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جنہیں زبردستی ان کے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا

گیا تھا۔ سکھ اور ہندو خواتین دھاڑیں مار رہی تھیں اور انکے چہروں پر غم کے سائے منڈلا رہے تھے۔''

اعوان نے یہ نکتہ بھی اُجاگر کیا کہ ان میں سے اکثر مہاجرین اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ جلد ہی اپنے گھروں کو واپس لوٹ آئیں گے۔ اس کے بقول ''لوگوں کی اکثریت کا خیال یہ تھا کہ یہ صدمہ عارضی وقت کیلئے ہے اور وہ کسی نیک مقصد کیلئے یہاں سے نہیں جا رہے تھے: وہ اس اُمید کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک دِن وہ سرگودھا میں اپنے گھروں کو واپس لوٹ آئیں گے۔''

اُس کے بعد وہ اُس وقت کا ذکر کرتا ہے کہ اُس کے والد صاحب نے کس طرح غیر مسلموں سے بھری ہوئی ایک بس کو تخریبی عناصر کے حملے سے بچالیا تھا، ''علاقے کے بعض مجرمانہ ذہن رکھنے والے عناصر انڈیا ہجرت کر کے جانے والے لوگوں کو ہلاک کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ سکھوں کا ایک گروہ جو کہ بس میں تھا غنڈوں کے حملے کی زد میں آ گیا۔ ان جرائم پیشہ لوگوں نے بس رکوانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہ بس میں بیٹھے ہوئے سکھ خاندانوں پر حملہ کرنے ہی لگے تھے کہ خوش قسمتی سے اسی وقت میرے والد صاحب ملک غضنفر وہاں پر پہنچ گئے جن کے ساتھ ان کے ماتحت بھی تھے۔ اُنہوں (پولیس) نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی جس سے غنڈوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ملک صاحب اور ان کے ماتحتوں نے اُنہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور یوں بس کو وہاں سے بغیر کسی لوٹ مار یا ہلاکت کے روانہ ہو جانے اور ان خاندانوں کے محفوظ سفر کو یقینی بنا دینے میں مدد مل گئی۔''

پولیس کے تحفظ میں سکھ خاندان بحفاظت فوجی کیمپ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرگودھا کے مقامی گوردوارہ انچارج نے اس کے والد صاحب کو ایک دیوار گیر کلاک اور بندوق ان کی انسان دوستی اور نرم دِلی کے صلے میں بطور تحفہ عطا کی تھی۔ بعد ازاں سکھ خاندانوں نے انسپکٹر غضنفر اعوان اور اس کے ماتحت پولیس والوں کا ان کی زندگیاں بچانے پر شکریہ ادا کیا۔ سکھ خاندانوں کو اپنے گھر چھوڑتے ہوئے بہت ہی افسوس ہو رہا تھا مگر یہ حقیقت کہ ایک مسلمان پولیس والے نے ان کی زندگیاں بچالی تھیں۔ اُمید کی ایک کرن ثابت ہوئی۔ آخر کار جب وہ ایک بوجھل دِل کے ساتھ سرگودھا چھوڑ کر چلے گئے تو غضنفر اعوان کی رحم دِلی ایک ایسی چیز تھی جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔

اعوان نے ایک اور دلچسپ واقعہ بھی سنایا جو کہ 1946ء میں ماسٹر تارا سنگھ سے اس کی ملاقات سے متعلق ہے۔ بقول اعوان، ''جب میں سولہ برس کا تھا تو سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے دورۂ

شیخوپورہ کے دوران مجھے ان سے ملاقات کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ میرے والد ان دنوں شیخوپورہ میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھے۔ وہ ماسٹر تارا سنگھ کے سیکیورٹی انچارج تھے۔ اس طرح سے مجھے اپنے والد صاحب کے ہمراہ ماسٹر تارا سنگھ سے ظہرانے کی دعوت پر ملاقات کا موقع مل گیا۔ جب میرے والد صاحب نے مسٹر سنگھ سے بھری ہوئی ایک بس کو مسلمان تخریب کاروں کے حملے سے بچالیا تھا تو ماسٹر تارا سنگھ نے تمام سکھوں کی طرف سے ان کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرطِ جذبات سے اُنہیں گلے لگالیا۔''

اعوان نے 4 مرتبہ انڈیا کا دورہ کیا ہے اور یہ سارے دورے سرکاری نوعیت کے تھے۔ اپنے انڈیا کے دوروں سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے اعوان نے بتایا:

''انڈیا کا دورہ میرے لئے ہمیشہ ایک خوشگوار تجربے کی مانند رہا ہے۔ چونکہ میرے یہ دورے سرکاری نوعیت کے تھے اس لئے مجھے وہاں کے میٹریالوجیکل یا محکمہ موسمیات کے افسران کے ساتھ ہی انڈیا کے انڈس واٹر کمشنر مسٹر مہتہ سے ملاقات کا موقع بھی ملا تھا۔''

اپنے انڈیا کے دوروں کے دوران اُسے نیو دہلی اور آگرہ جانے کے ساتھ ہی مغلیہ دور کی بہت سے تاریخی مقامات کی سیر کا موقع بھی ملتا رہا۔ اس نے عظیم صوفی شخصیات حضرت نظام الدین اولیا، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، اور حضرت امیر خسرو کی درگاہوں کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ وہ اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور لدھیانہ میں حضرت مجدد علی ثانی اور اس کے علاوہ چند ایک اور صوفیائے کرام کے مزارات کی زیارت بھی کرنا چاہتا ہے۔

اُس کا مزید کہنا ہے کہ ''انڈیا میں آپ کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آپ اپنے دوسرے گھر میں آگئے ہوں۔ 60 برس کی علیحدگی ہمارے مشترکہ ثقافتی اور سماجی ورثے خاص طور پر پنجاب کی روایات کو ماند نہیں کرسکتی۔''

اعوان صوفی ازم کا بہت بڑا معتقد ہے اور اس کا پختہ یقین ہے کہ: ''ہم مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کو بڑے بڑے صوفیاء کی تعلیمات کی پیروی کرنی چاہیے تاکہ برصغیر میں امن، محبت، اور ہم آہنگی کی روایات پروان چڑھ جائیں۔

## احمد سلیم: برصغیر کی تقسیم اور میانہ گوندل

احمد سلیم کے پاس جو کہ جنوری 1945ء میں پیدا ہوا، تذکرے کے لئے بہت دلچسپ واقعات ہیں۔ پہلا اس کے والد صاحب کی طرف سے تقسیم کے دوران ایک ایسے سکھ جوڑے کو پناہ دینے سے متعلق ہے جو اگرچہ بھاگ نکلا تھا مگر بعدازاں گاؤں کے ایک کھیت سے اس کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ دوسرا واقعہ وہ ہے جو اس کے والد صاحب نے ان مسلمان فوجیوں کے بارے سُنایا تھا جنہوں نے بے گناہ غیر مسلموں کو بچانے کیلئے مسلمانوں کے ایک گروہ پر گولی چلادی تھی۔ اور آخری یہ کہ سلیم انڈو۔ پاک امن تحریک میں بھی بہت متحرک ہے اور اس کے علاوہ اس نے پاک۔ بھارت تعلقات اور برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر کچھ کتابیں بھی لکھیں ہیں۔

احمد سلیم کا خاندان میانہ گوندل میں رہائش پذیر تھا جو کہ ضلع گجرات کی حدود میں واقع تھا۔ تاہم تقسیم کے بعد جنرل ضیاء کے دورِ حکومت میں منڈی بہاءالدین کے نام سے ایک نیا ضلع قائم کر دیا گیا اور متذکرہ گاؤں اس کے اندر آ گیا۔

اپنے گاؤں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے احمد سلیم نے بتایا کہ تقسیم سے قبل میانہ گوندل میں بہت سے غیر مسلم قیام پذیر تھے اگرچہ مسلمانوں کی یہاں اکثریت تھی۔ یہ علاقہ مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کی علامت تھا۔ اگرچہ گاؤں کے مختلف فرقوں میں باہمی شادیوں کا رواج تو نہیں تھا تاہم تمام لوگ ایک دوسرے کی شادیوں میں شرکت کے علاوہ باقی تقریبات میں بھی بھرپور حصہ لیتے تھے۔ مذہب کا اختلاف بس اس حد تک تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی شادی کی تقریبات میں کھانا نہیں کھاتے تھے۔

احمد سلیم کے والد صاحب کی ذات اروڑھ تھی اور والدہ صاحبہ سہگل خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ چھ یا سات پشت پہلے اس کے آباؤ اجداد ہندو تھے اگرچہ بعد میں وہ مسلمان ہو گئے۔ اس کے دادا کی کپڑوں کی دکان تھی جس کا نام تھا مسلمان دی ہٹی۔ اُن کے گاہکوں میں سکھوں اور ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد شامل تھی۔

اس وقع کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے کہ اُس کے دادا جی نے کس طرح ایک سکھ خاندان کو بچانے کی کوشش کی تھی جو اصل میں بچ نکل جانے میں کامیاب ہونے کے بعد موت کے مُنہ میں چلے گئے تھے۔

کہا کہ:

''ستمبر 1947ء میں ایک سکھ جوڑے نے جن کے ساتھ ان کا ایک شیر خوار بچہ بھی تھا میرے دادا جی سے پناہ کی درخواست کی کیونکہ ان کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مختلف تنبیہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس جوڑے کو اپنے گھر پناہ دے دی۔ بلوائی نہ صرف یہ کہ جوڑے کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے بلکہ اُنہوں نے میرے دادا جی کو بھی دھمکی دے ڈالی کہ وہ انہیں زیادہ عرصہ کے لئے پناہ نہیں دے سکتے ورنہ انہیں سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے سکھوں کو پناہ دینے کی وجہ سے میرے خاندان کا سماجی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ تاہم میرے دادا جی نے ہر طرح کا سماجی دباؤ برداشت کرتے ہوئے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس جوڑے کو اپنے گھر میں پناہ دیئے رکھیں گے۔ ایک دن وہ سکھ جوڑا اپنی بیٹی کے ساتھ خاندان کے کسی بھی فرد کو اِطلاع دیئے بغیر گھر سے غائب ہو گیا۔ اس فیصلے کی ایک ممکنہ وجہ غالباً میرے خاندان، خصوصاً دادا جی پر پڑنے والا دباؤ تھا۔ اگلے دن گاؤں میں کپاس کے کھیتوں سے اُس جوڑے اور ان کی بیٹی کی لاشیں برآمد ہو گئیں، اگرچہ وہ کئی برسوں سے یہاں رہ رہے تھے۔ میرے دادا جی کے لئے یہ خبر جان لیوا ثابت ہوئی: یہ المناک خبر سنتے ہی اُنہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔''

احمد سلیم نے مزید بتایا کہ اُس کے والد صاحب نے بھی تقسیم کے دنوں کی بہت سی یادداشتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بقول سلیم: ''ستمبر 1947ء میں ہندو اور سکھ ہمارے دیہات سے ہجرت کر کے انڈیا کے مشرقی پنجاب میں مُنتقل ہو رہے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ ٹرک اور ٹرالے استعمال کر رہے تھے کچھ غیر قانونی عناصر جن کا تعلق دوسرے دیہاتوں سے تھا، دیہات کی بڑی سڑکوں پر رواں دواں ان لڑکوں پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ مسلمان فوجی ان لڑکوں کے تحفظ اور امن وامان کے قیام کے مقصد سے تعینات کر دیئے گئے تھے۔ مسلمان فوجیوں نے ان شر پسند عناصر کو حکم دیا کہ وہ ان لڑکوں سے دور رہیں۔ مگر اُنہوں نے ان فوجیوں کی بات نہ مانی اور لڑکوں کی طرف بڑھتے رہے۔ جیسے ہی فوجیوں نے ان لُٹیروں پر گولی چلائی تا کہ امن وامان میں خلل نہ پڑے تو ایک مسلمان ہلاک اور ایک زخمی ہو گیا، جبکہ باقی ماندہ بھاگ نکلے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان فوجی اپنا فرض مکمل تندہی سے ادا کر رہے تھے۔ ان کے لئے امن وامان قائم رکھنے کا فریضہ ان کے مذہبی جذبات سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔''

پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے سلیم کہتا ہے کہ انڈیا اور

پاکستان اب آزاد ریاستیں ہیں اور اب سرحدیں ختم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر سفر کی راہ میں حائل ذہنی سرحدیں اور رکاوٹیں دور کی جا سکتی ہیں۔ مسئلہ کشمیر ایک پُرامن انداز میں کسی فریق کے مفاد کو نظر انداز کیے بغیر حل کیا جانا چاہیے۔

احمد سلیم نے کئی بار انڈیا کا دورہ کیا ہے اور وہ تقسیم کے موضوع پر مشہور کتاب ''لاہور 1947'' کا ایڈیٹر بھی ہے۔

## پروفیسر رفیق محمد: ایک آٹھ برس کے بچے کی آزمائشیں اور مصائب

پروفیسر رفیق گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں تاریخ پڑھاتا ہے اور اس کے گھر والوں کو بھٹنڈا سے نقل مکانی کے دوران چند غیر مسلموں بشمول ان کے دودھ فروش نے موت کے مُنہ سے بچا لیا تھا۔

اُس وقت وہ آٹھ برس کا تھا اور تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ اُسے تقسیم کے دوران پیش آنے والے واقعات بہت اچھی طرح سے یاد ہیں۔ وہ بھٹنڈا میں ریلوے کالونی کے اندر رہائش پذیر تھے۔ جب ہنگامے شروع ہوئے تھے تو اس سے قبل ہر طرف مکمل امن وامان تھا۔ اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے رفیق محمد نے یوں تبصرہ کیا:

''میرے والد صاحب بھٹنڈا میں ریلوے ملازم تھے۔ تقسیم کے اعلان کے تقریباً ایک ہفتے بعد ہم مسلمانوں کو پاکستان لے جانے والی ٹرین پر سوار ہو گئے تھے۔ میری والدہ اور میں اپنی بہن سے کافی فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ اُسے ڈبے کے اندر ریلوے کالونی کی دوسری خواتین کے درمیان دور جگہ ملی تھی۔ ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ٹرین کو دھلی سے ہو کر لاہور پہنچنا تھا۔ مگر بھٹنڈا سے اگلے سٹیشن پر ہی ٹرین میں قتل وغارت گری شروع ہو گئی۔ مسافروں کو محض اس لیے ذبح کیا جا رہا تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ قاتل علاقے کے بہت ہی نوجوان قسم کے سکھ تھے۔ مجھے اپنی والدہ سمیت ٹرین سے نکال لیا گیا۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے۔ میری والدہ اور میں آخر کار سکھوں کے ایک دیہات میں پہنچ گئے جہاں ہمیں ساتھ والے دیہاتوں کے سکھوں کے حملے سے پناہ دے دی گئی۔ یہ سب کچھ ایسے لگ رہا تھا جیسے خدا کی طرف سے ہمیں آخر کار چند ایک رحم دل سکھوں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا۔

ہم تقریباً دو ہفتے اسی گاؤں میں رہے۔ اس گاؤں میں رہنے والے سکھ خاندان ہمارے اوپر بہت مہربان تھے اور اُنہوں نے ہمیں تحفظ دیا۔ میری والدہ حاملہ تھیں اور بمشکل ہی چل پھر سکتی تھیں۔ سکھوں کی طرف سے پناہ ملنے کے بعد ان کے اندر کچھ احساس تحفظ پیدا ہوا۔ تاہم ایک بچھڑ جانے والے خاندان کے ارکان کے طور پر ہم صدمے کی حالت میں تھے۔ ہمیں اپنے والد اور بہن کے بارے میں جو کہ ہمارے ساتھ ہی ٹرین پر سوار ہوئے تھے، کبھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ ہمیں تحفظ دینے والے سکھوں کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے ایک دِن دیکھا کہ ایک شناسا دِکھائی دینے والا شخص گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی والدہ کو بتایا اور وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں کہ یہ وہ دودھ فروش تھا جو بھٹنڈا ریلوے کالونی میں ہمیں دودھ دے جاتا تھا۔ اس نے بھی ہمیں پہچان لیا اور ساتھ ہی ضرورت پڑنے پر اپنی مدد فراہم کرنے کی پیشکش بھی کر دی۔

جیسے جیسے فسادات پھیلتے گئے ویسے ویسے گاؤں میں افواہیں اُڑنا شروع ہو گئیں۔ ایسا وقت بھی آیا جب گاؤں کے نوجوانوں کو ہاتھ میں تلواریں اور دِل میں خوف لئے علاقے کے گرد چکر کاٹنے پڑ جاتے۔ خوفناک حالات کو دیکھتے ہوئے، اُس گھر کی عورتوں نے جہاں ہم رہ رہے تھے، ہمیں نکال باہر کیا کیونکہ ان کے اپنے خاندان کی بقاء خطرے میں پڑی ہوئی تھی۔ میری والدہ اور میں نے اِردگرد کے لوگوں کی منت سماجت کی کہ کسی طرح ہمیں اُس دودھ فروش کے گھر پہنچا دیں۔ اُنہوں نے ہمیں وہیں پہنچا دیا اور ہم لوگ اب اپنے نئے میزبان کی نیک سیرت بیوی کی پناہ میں تھے۔ اس گھر میں چار افراد تھے: ماں، باپ، ایک بڑی عمر کا بیٹا اور دودھ فروش کا چھوٹا بھائی۔ وہ سب کے سب بہت ہی ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے، خاص طور پر ان کی ماں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہمارے محافظوں کو ہمیں کھیتوں کے اندر چھپا دینا پڑا اور میں اور میری والدہ بال بال بچ گئے تھے۔ وہ عدم تحفظ اور بے بسی کے لمحات بھلائے نہیں جا سکتے۔ اس گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے ہمیں سکھ مذہب اپنا لینے کا مشورہ بھی دیا جو کہ میرے لئے ایک انتہائی دلچسپ تجویز تھی مگر مجھے اس حوالے سے اپنی والدہ کے احساسات معلوم نہیں ہیں۔

اس گاؤں اور ریلوے کالونی بھٹنڈا کے درمیان دودھ فروش کی وجہ سے تعلق برقرار تھا۔ یہ سارا خاندان ہمارے لئے باعث رحمت ثابت ہوا اور آخر کار اِنہی لوگوں کی کوششوں سے ہم دوبارہ بحفاظت ریلوے کالونی پہنچ گئے۔ ہمارے میزبان نے ہمارے لئے ریلوے کالونی کے ایک

ہندو کے گھر قیام کا بندوبست کر دیا جو کہ میرے والد صاحب کے دوستوں میں سے تھا۔ ہم کچھ روز والد صاحب کے اس دوست کے گھر رہے۔

کالونی کے جانے پہچانے لوگ ہمارے لئے ہمدردی کے جذبات سے بھرپور تھے۔ خوش قسمتی سے مسلمانوں کے لئے بھٹنڈا میں ایک عدد مہاجر کیمپ بھی انہی دنوں میں قائم کر دیا گیا تھا۔ میری والدہ نے اسی کیمپ میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اب ہماری پاکستان بحفاظت روانگی کی امید یہی کیمپ ہی رہ گیا تھا۔ ایک موہوم سی اُمید یہ بھی رہ گئی تھی کہ میرے والد صاحب اور میری بہن ابھی تک زندہ ہوں گے۔ تاہم ریلوے کالونی میں بھی مستقل قیام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب وہاں سے بچ نکلنے کا واحد راستہ مہاجر کیمپ میں شمولیت ہی رہ گیا تھا۔ چنانچہ ہم کیمپ میں منتقل ہو گئے۔

اس کیمپ کا مقصد یہ تھا کہ جتنے زیادہ مہاجر اکٹھے ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے تا کہ اُنہیں پھر فوج کی نگرانی میں پاکستان روانہ کر دیا جائے۔ جب ہم کیمپ میں تھے تو والدہ کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور اُنہوں نے مجھے بتایا کہ یہ شخص تمہارے والد کا دوست لکھتا ہے۔ والدہ نے کہا کہ میں اس کے پاس جاؤں اور ساری روداد بیان کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ حسبِ توقع اس نے ہم سے اظہارِ ہمدردی کیا اور ہمارا تعارف ایک اور خاندان سے کرایا تا کہ ہم اُن سے اپنی پریشانیاں بانٹ سکیں۔

ہم نے اپنا سفر ستمبر 1947ء کی ایک شام کو شروع کیا اور ایک فوجی ٹرین پر سوار ہو کر پاکستان روانہ ہو گئے۔ یہ ٹرین بہاولنگر، سمہ سٹہ، خان پور، روپڑی کے راستے کراچی تک جا رہی تھی۔ اُس شریف آدمی نے جس کے ساتھ ہم پاکستان میں میرے والد صاحب اور بہن کو ڈھونڈ نکالنے سے قبل کچھ عرصہ رہتے رہے تھے، ٹامیوالی کے اسٹنٹ سٹیشن ماسٹر سے ملاقات کی اور چند جملوں کا تبادلہ کیا۔ اسٹیشن ماسٹر اور اس جانے پہچانے شخص نے ہمیں ٹرین سے نیچے اترنے کا کہا اور اسٹیشن ماسٹر ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے ساتھ متصل ایک رہائش گاہ تک لے گیا۔ اُس کی ابھی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم نے بقیہ سارا دن اس گھر میں گزارا۔ شام کے وقت ایک معجزہ رونما ہوا۔ میرے والد صاحب نے دروازے پر دستک دی اور اسٹیشن ماسٹر نے ان کا استقبال کیا۔ یہ بالکل ہی غیر متوقع ملاقات جنت سے آنے والے کسی من وسلویٰ کی طرح تھی۔

جو واقعات پیش آئے تھے وہ اصل میں ایک ہی سلسلے میں اس طرح مربوط تھے جس کا

نتیجہ ایک بچھڑے ہوئے خاندان کے ملاپ کی صورت میں نکلا تھا۔

خُدائی تدبیر یا حکمت جو اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آئی یہ تھی کہ جب ٹرین میں قتل وغارت گری ہوگئی تو یہ ایک نہر کے اوپر جا کر رُک گئی جو کہ ریلوے لائن کے پار سے گزر رہی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ لاشیں نہر میں پھینک دی جائیں گی۔ میرے والد صاحب نے حملے سے بچنے کے لئے ٹائلٹ میں پناہ لے لی تھی۔ لاشوں کو نہر میں پھینکتے ہوئے ٹائلٹ کے دروازے کی نشاندہی نہ ہوسکی کیونکہ ٹائلٹ کا دروازہ کمپارٹمنٹ کے دروازے ساتھ متصل تھا۔ جب کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا گیا تو وہ ٹائلٹ کے دروازے کے پیچھے آ گیا۔ چنانچہ اس دروازے پر کسی کی نظر نہ پڑ سکی اور ٹرین سے لاشیں پھینکنے کے پورے وقت کے دوران بند پڑا رہا۔ ایک بار پھر خدائی رحمت کا نزول۔

میری ہمشیرہ ریلوے سٹاف کی دیگر خواتین کے ہمراہ وہیں بیٹھی رہی کیونکہ وہ سب بھی پاکستان جانے کے ارادے سے ٹرین میں بیٹھی تھیں۔ اُن سب نے یہی ظاہر کیا کہ وہ ہندو تھیں۔ چنانچہ یوں وہ حملہ آوروں کی خونریزی کا شکار ہونے سے بچ گئیں۔ وہ سب بڑی بے بسی کی اور صدماتی کیفیت میں اپنے خاندان کے مردوں کا قتلِ عام دیکھتی رہیں۔ میری ہمشیرہ بھی جب مجھے اور ماں کو ٹرین سے لے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی تو چپ چاپ بے بسی کے عالم میں دیکھتے رہنے کہ سوا کچھ نہ کر سکی۔ اس وقت اس کے کیا احساسات تھے میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

فیروز پور پہنچ کر صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے ٹرین روک دی گئی۔ جو لوگ کسی طرح حملہ آوروں سے خود کو بچا لینے میں کامیاب ہوگئے تھے باہر نکل کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ یہ ان سب لوگوں کے آہ وزاری وغم ورنج کے اظہار کا عظیم لمحہ تھا کیونکہ ٹرین کے اندر بیٹھے ہوئے کوئی بھی اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اب گریہ وماتم کرنے کا وقت تھا۔ میرے والد صاحب کو میری ہمشیرہ مل گئی تھی اور اُنہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں اور میری والدہ اُس وقت ہی ٹرین سے اتار لئے گئے تھے جب ٹرین پر حملے کے ساتھ ہی قتلِ عام جاری تھا۔

میرے والد صاحب نے اُس وقت یقیناً بہت حوصلے سے کام لیا ہوگا جب وہ زندگی بچانے کے لئے جنگل کی طرف بڑھے ہوں گے کیونکہ اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ٹرین نے میرے والد صاحب اور بہن کو فیروز پور سے اُٹھا کر قصور اور پھر لاہور تک پہنچا دیا۔ وہاں میرے والد صاحب نے ڈویژنل سپرنٹنڈینٹ ریلوے کے دفتر میں رپورٹ پیش کی اور انہیں

تعیناتی کے لئے آگے ملتان میں رپورٹ کرنے کا کہا گیا۔ اُنہیں اسی درجے اور تنخواہ کے ساتھ سمہ سٹہ بھیج دیا گیا جہاں اُنہوں نے ہدایات کے مطابق نوکری پر حاضر ہونے کی رپورٹ دے دی۔ لاہور پہنچنے، ملتان جا کر رپورٹ پیش کرنے اور آخر کار سمہ سٹہ میں تعیناتی کا یہ سارا کا سارا عمل اُس سے پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا جب میں اور میری والدہ ٹامیوالی میں اسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے ہاں قیام کے لئے موجود تھے۔

خوش قسمتی سے میرے والد کو کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ انڈیا سے مہاجرین کو لے کر آنے والی ایک سپیشل ملٹری ٹرین سمہ سٹہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی ہے۔ وہ بھاگ کر اس اُمید کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے کہ ان کی بیوی اور بیٹا بھی اس ٹرین میں مہاجرین کے اندر موجود ہو سکتے تھے۔ اُنہوں نے ہمیں ہجوم کے اندر تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر مایوسی ہوئی۔ اُنہوں نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ آیا کسی نے آٹھ سال کے بچے اور اس کے ساتھ اس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ایک عورت کو دیکھا ہے۔ اُنہیں کسی نے بتایا کہ کہ اس عمر کا بچہ اور ساتھ ہی ایک عورت کو ٹامیوالی اسٹیشن پر ٹرین سے نیچے اتارا گیا تھا۔ میرے والد نے قسمت آزمائی کی اور اگلی ٹرین سے ٹامیوالی پہنچ گئے۔ ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور قسمت ان پر مہربان تھی۔ میں نے والد صاحب سے اپنی بہن کے بارے میں دریافت کیا اور اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ گھر میں بالکل خیریت سے تھی۔ اور یوں آخر کار ہم سب ایک لمبی اور اذیت ناک جُدائی کے بعد سمہ سٹہ اسٹیشن پر ایک بار پھر یکجا ہو گئے۔ میری والدہ کو اپنے خاوند اور دس برس کی بچی کی جدائی کا صدمہ اُٹھانا پڑا تھا۔ ان کی بینائی اس حد تک متاثر ہو چکی تھی کہ وہ رات کے وقت دیکھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ تنہائی میں کئی کئی گھنٹے چپکے چپکے اپنی حالت زار پر گریہ زاری کرنے کرنے کا افسوسناک انجام یہ نکلا کہ وہ پاکستان پہنچنے کے تین ہفتوں کے اندر اندر انتقال کر گئیں۔

رفیق نے اپنی کہانی کو ایک جذباتی اور فلسفیانہ رنگ دیتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ سمیٹا:

''کیا اب بھی معجزے ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے بہت سی تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں اس سے قبل کہ وہ راحت میں بدل جائیں۔ غم اور خوشی دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں کے مابین امتیاز کو مٹا کر رکھ دینا ہی شاید قدرت کا منشا ہوتا ہے۔ بُرائی اچھائی کے کس پہلو کو پوشیدہ رکھتی ہے کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ غم خوشی کے اندر سے کیا باہر لاتا ہے ایک راز ہے۔ اللہ

تعالیٰ بُری قسمت کے اندر جو کچھ چھپا کر رکھتا ہے وہ آخر کار بُری قسمت نہیں ہوتی۔ مُثبت اور منفی دونوں مل کر آخر کار خُدائی تدبیر کو سچا ثابت کر دیتے ہیں خدائی تدبیر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جب تک ہم انسان میں اس تفریق یا امتیاز سے ماورا نہیں ہو سکتے تاہم یہ حتمی مقدر نہیں ہے۔ ہم اس تفریق سے آگے بھی نکل سکتے ہیں کیونکہ ہم صرف انسان ہی نہیں ہیں بلکہ ہمارے اندر آفاقیت کا عنصر بھی موجود ہے۔ ہم نے صرف اسی کا احساس یا شعور حاصل کرنا ہوتا ہے۔''

## عمر فاروق ملک: جسے ایک سکھ گارڈ نے بھٹکنے سے بچالیا

74 سالہ عمر فاروق ملک سمن آباد لاہور کا رہائشی ہے۔ وہ پاکستان کے محکمہ پانی و بجلی سے جسے واپدا کہتے ہیں، ایک اکاؤنٹس آفیسر کے طور پر ریٹائر ہوا ہے۔

فسادات کے دور کے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے عمر فاروق کہتا ہے، ''ایک سکھ ریلوے گارڈ نے امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر میری جان بچالی تھی۔ میں 1947ء میں ساتویں کلاس کا طالب علم تھا۔ ہمارا خاندان لاہور میں چوبُرجی گارڈنز کے قریب اسلامیہ پارک میں سکونت پذیر تھا۔ میرا خاندان میرے والدین، ایک چھوٹے بھائی رفیع ملک، اور چار بہنوں، نسیم، نارا، ثریا اور کشور پر مشتمل تھا۔ ہمارے ہمسائے میں ہندوؤں اور سکھوں کے کچھ خاندان آباد تھے جو کہ ایک محلے میں رہتے تھے، مگر اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مسلمانوں کے دونوں فرقوں کے ساتھ گرمجوشی تعلقات تھے۔''

''انڈین مسلم لیگ، کانگرس اور اکالی دل کا برطانیہ کی حکومتِ ہند کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس کے نتیجے میں 3 جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں فسادات کے ساتھ ہی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان غیر ضروری خلیج حائل ہوتی گئی حالانکہ وہ کئی صدیوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے۔ محمد علی جناح، جواہر لعل نہرو اور بلدیو سنگھ نے ریڈیو پر تقریریں کر کے تمام فرقوں کے عوام کو پُرامن رہنے کی تلقین کی تھی۔ مگر تینوں فرقوں کے اندر غیر قانونی اور غیر انسانی عناصر نے دونوں پنجابوں کے اندر بڑے پیمانے پر فسادات کی آگ بھڑکانا شروع کر دی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے مشرقی پاکستان سے اور ہندوؤں اور سکھوں نے مغربی پنجاب سے ہجرت شروع کر دی اور اپنی جائیدادیں اور اثاثے بڑی تعداد میں پیچھے چھوڑ

دیئے۔ بدقسمتی سے سرحد کے دونوں اطراف تینوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد کو ہلاک کرنے کے ساتھ ہی عورتوں کے اغواء عصمت دری اور قتل کے واقعات بھی دیکھنے میں آئے۔ تاہم ان تمام فرقوں کے اندر ایسے انسان دوست لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے دوسرے عقائد سے تعلق رکھنے والے افراد کی جانیں بھی بچائیں۔ ان افراد کے لئے انسانی اقدار اور ہمدردی کے اوصاف باقی تمام چیزوں پر فوقیت رکھتے تھے۔''

اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے عمر فاروق نے بتایا کہ ''میرے والد صاحب، مرحوم ملک عبدالغنی خان کا تعلق دراصل ضلع گورداسپور (تحصیل بٹالہ) سے اور والدہ مرحومہ ممتاز بیگم کا تعلق مشرقی پنجاب کے ضلع امرتسر سے تھا۔ تاہم وہ تقسیم سے پہلے ہی لاہور میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔''

اپنی آپ بیتی سُناتے ہوئے، اُس نے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے کہا کہ: ''یہ مئی 1947ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں میرے ایک خالو مُغل پورہ، لاہور میں رہتے تھے۔ مغل پورہ اندرونِ لاہور سے دس کلومیٹر دور لاہور کے مشرق میں واقع ہے۔ اس زمانے میں لوگ لاہور کے وسطی اور دیگر علاقوں سے بذریعہ ٹرین مُغل پورہ جاتے تھے۔ یہی ٹرین آگے امرتسر روانہ ہو جاتی تھی اور مغلپورہ لاہور اور امرتسر کے درمیان ایک ریلوے سٹیشن تھا۔ اس دن میرے ایک رشتہ دار کی شادی تھی۔ خاندان کے دیگر لوگ بشمول میرے والدین، چھوٹے بھائی اور بہنیں شادی سے کچھ روز پہلے ہی مغل پورہ پہنچ چکے تھے۔ میں اُس دِن ان کے ساتھ اس لیے نہیں جا سکا تھا کیونکہ میرے والد صاحب اور بقیہ گھر والوں نے مجھے یہ کہا تھا کہ میں اگلے دن بذریعہ ٹرین وہاں آؤں۔ چنانچہ اگلے دِن میں نے ٹرین پکڑی جو کہ امرتسر جا رہی تھی۔ ٹرین نے اگرچہ مُغل پورہ ریولے اسٹیشن پر رُکنا تھا مگر کچھ وجوہات شاید حملے یا تشدد کی کاروائیوں کا خوف وغیرہ کی بناء پر ٹرین وہاں رُکے بغیر سیدھی امرتسر پہنچ گئی۔''

اس علم کے بعد کہ ٹرین سیدھی امرتسر پہنچ چکی ہے، اپنی بدحواسی بیان کرتے ہوئے ملک نے بتایا، ''میں مکمل طور پر چکرایا ہوا اور خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میں شدید پریشان تھا کیونکہ تشدد اور فسادات کی لہر پھیل چکی تھی اور سب سے بڑی مصیبت یہ کہ میرے پاس واپس لاہور جانے کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ بغیر پیسوں کے دل میں انجانے خوف کا احساس لئے میں امرتسر کے

ریلوے اسٹیشن پر بالکل مایوس کھڑا ہوا تھا۔ چونکہ فسادات جاری تھے اس لیے میں بدترین صورتحال کے لئے بھی تیار تھا، اور اکیلا ہی ریوے سٹیشن پر کھڑا ہوا تھا۔ میں اس وقت تو بالکل ہی بوکھلا کر رہ گیا جب دردی میں ملبوس 40-45 برس کے لگ بھگ بلونت سنگھ نامی ایک ریلوے گارڈ نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر حیران و پریشان پھرتے دیکھ لیا۔ بلونت سنگھ کو الہامی طور پر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی پریشانی میں مُبتلا ہوں کیونکہ میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں۔''

ریلوے گارڈ میری طرف آیا اور بولا، ''اے نوجوان آدمی تم کس پریشانی میں مُبتلا ہو؟'' میں نے اُسے سارا قصہ سُنا ڈالا کہ کس طرح ٹرین وہاں پر نہیں رُکی جہاں پر مجھے اُترنا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں مسلمان تھا۔ گارڈ نے میرے کندھوں پر ہاتھ مارا اور یہ یقین دلاتے ہوئے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں مجھے اسٹیشن ماسٹر کے عمرے میں لے گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے بحفاظت واپس لاہور بھجوا دے گا۔ اس دوران گارڈ نے میری چائے اور بسکٹ سے تواضع کی۔

اس کے بعد ملک یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ گارڈ نے اُسے کس طرح واپس لاہور بھجوایا۔

''دو گھنٹوں کے بعد جب لاہور کے لئے مخصوص ٹرین لدھیانہ سے امرتسر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی تو گارڈ نے ٹرین ڈرائیور کو ہدایت کر دی کہ وہ مجھے مغلپورہ ریلوے اسٹیشن پر اُتار دے۔ بلونت سنگھ نے اس امر کو یقینی بنایا کہ میں ڈرائیور کے ساتھ ہی رہوں تا کہ بالکل حفاظت کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں۔ میں اسی رات کو مغل پورہ ریلوے اسٹیشن بالکل غیر و عافیت واپس پہنچ گیا۔ میرے گھر والے بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں سارا واقعہ سُنا ڈالا کہ کس طرح ٹرین براہِ راست، بغیر رُکے، امرتسر پہنچ گئی تھی۔ میرے گھر والے میری کہانی سُن کر بالکل ہی ہکا بکا رہ گئے اور اُنہوں نے خدا اور بلونت سنگھ کا شکر ادا کیا۔

بات کو اختتام پذیر کرتے ہوئے عمر فاروق نے کہا، ''بلونت سنگھ کی نرم دلی کی یاد ابھی تک میرے دِل میں تازہ ہے۔ میں ایک ایسے وقت میں جبکہ انسانیت مکمل طور پر اپنے حواس سے محروم نظر آ رہی تھی اس کی ہمدردی کا شکر ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ مجھے بلونت سنگھ کا احسان زندگی کے آخری دن تک نہیں بھولے گا۔ مسلمان، ہندو اور سکھ فرقوں میں اس طرح کے فراخ دِل لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔''

عمر فاروق نے ایک ایسے مسلمان خاندان میں شادی کی تھی جن کا تعلق امرتسر سے تھا۔

بعدازاں تقسیم کے بعد اس کے سُسرال والے لائلپور (فیصل آباد) مُنتقل ہوگئے۔ اس کی شریک حیات ثروت فردوس ایچی سن کالج لاہور سے ایک ٹیچر کے طور پر ریٹائر ہوچکی ہے۔ ان کے تین بچے ہیں (علی، مونا اور ففی) 65 سالہ مسز فاورق نے جو کہ امرتسر میں پیدا ہوئی تھی بتایا کہ اُس کے والد میاں محمد سعید شریف نے تقسیم کے دوران اپنے اہل خانہ سمیت امرتسر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دادا جان میاں محمد شریف صاحب امرتسر کی ایک معروف کاروباری شخصیت تھے۔ امرتسر کا شریف پورہ نامی مشہور علاقہ ان کے دادا کے نام پر ہے۔ ان کی بہت سی دوکانیں اور مکانات تھے اس لیے علاقے کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔ وہ پنجاب اسمبلی کے رُکن بھی رہے ہیں۔

تقسیم کے دوران، جب پنجاب فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تو ثروت اپنی بڑی بہت مرحومہ پروین بیگم (جن کا فروری 2008ء میں انتقال ہوگیا تھا)، والدہ فرخندہ بیگم (جن کا جون 1997ء میں انتقال ہوا) اور والد میاں محمد سعید (وفات ستمبر 1973ء) کے ساتھ پانی پت میں تھیں۔ اس کے والد میاں محمد سعید صاحب اون کا کاروبار کر رہے تھے۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ وہیں پر ہی رُکے رہے، اُس اُمید پر کہ حالات جلد ہی ٹھیک ہوجائیں گے اور چند ماہ کے اندر اندر امن وامان بحال ہوجائے گا اور وہ خاندان کے ساتھ واپس امرتسر چلے جائیں گے۔ چنانچہ وہ اگست 1947ء میں پاکستان مُنتقل نہ ہوئے جبکہ باقی بہن بھائی ہجرت کر کے وہاں جا چکے تھے۔ جب حالات قابو سے باہر ہوگئے تو میاں محمد سعید نے بھی پاکستان مُنتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

سعید صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ کراچی منتقل ہوئے اور وہاں پر اپنا کاروبار جمالیا۔ مگر تین برس بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پنجاب (پاکستان) آ گئے۔ ثروت کے گھر والوں نے کوٹ رادھا کشن میں اس کے نانا جان کے گھر قیام کیا) موخرُ الذکر تقسیم کے بعد قادیان سے یہاں منتقل ہوئے تھے) چند ماہ یہاں قیام کرنے کے بعد ثروت کے خاندان والے جھنگ منتقل ہوگئے جہاں اس کے والد نے کمبلوں کا کاروبار شروع کردیا۔ میاں محمد سعید نے وہاں پر ایک عدد سینما ہاؤس اور سیمنٹ ایجنسی بھی خرید لی تھی۔ تقسیم کے بعد ثروت کو انڈیا جانے کا موقع نہ مل سکا مگر اس کے والد صاحب نے کئی مرتبہ وہاں کا دورہ کیا۔ ان دوروں کے دوران اُنہیں اپنے ہندو اور سکھ دوستوں سے ملاقات کا موقع بھی میسر آیا۔ تقسیم کے چند برسوں کے بعد اس کے والد صاحب کے دوست پانی پت کے رانا پرکاش اپنے پُرانے دوست (میاں سعید) کو ملنے کے لئے آئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ رانا پرکاش اپنے ساتھ کاروبار کا کچھ منافع بھی لائے جو میاں سعید صاحب کا حق بنتا تھا۔

تقسیم کے بعد ثروت کے ایک چچا امرتسر میں اپنی جائیداد کے سلسلے میں معلومات اِکٹھی کرنے کے لئے انڈیا تشریف لے گئے تا کہ ان کے خاندان کی طرف یہاں پاکستان میں بھی اتنی ہی جائیداد کا دعویٰ کیا جا سکے۔ قدرت کی ستم ظریفی سے اس کے چچا دِل کا دورہ پڑنے سے وہیں امرتسر میں ہی انتقال کر گئے۔

عمر فاروق اور اس کی اہلیہ دونوں کا یہی خیال ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے مابین اچھے تعلقات ضروری ہیں کیونکہ امن اور ہم آہنگی کے ذریعے ہی وہ غربت اور بیروزگاری جیسے مسائل کو حل کر سکتے ہیں جو کہ دونوں ممالک میں ایک عفریت کی شکل اختیار کر چلے ہیں۔

## خورشید بی بی: ایک بہادر آدمی کی بیٹی

74 سالہ خورشید بی بی جو کہ گڑھی شاہو ریلوے کوارٹرز کی مکین ہے، برٹش انڈین ریلویز کے ٹرین ڈرائیور پولو خان کی بیٹی ہے۔ وہ تقسیم کے دور میں لاہور میں تعینات تھا اور اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تاہم خورشید بی بی اپنے والد صاحب کی جو آپ بیتی سُناتی ہے وہ ہمارے تحقیق کے مرکزی موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کے والد صاحب نے خود اپنی آنکھوں سے دو ٹرینوں کے مسافروں کے قتل عام کا منظر دیکھا، اگرچہ اُنہوں نے دونوں ٹرینوں میں ہونے والی ان ہلاکتوں کو روکنے کی پوری پوری کوشش کی۔ پہلی ٹرین لدھیانہ سے لاہور جا رہی تھی اور دوسری ننکانہ صاحب سے امرتسر۔ پہلے واقعے میں مسلمانوں کو امرتسر کے قریب موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا جبکہ سکھوں اور ہندوؤں کی گردنیں لاہور کے قریب تن سے جُدا کر دی گئیں۔ کہانی کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب اس کا ایک رفیقِ کار گنگا رام جو کہ ایک ہندو تھا لاہور سے باہر کس اپنے سرکاری فرائض کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو پولو خان نے اس کے اہل خانہ کو پناہ دی تھی۔ گنگا رام کا خاندان تقسیم کے بعد کچھ عرصہ پاکستان کے اندر ہی محبوس رہا اور مسلمان ہو گیا مگر بعد ازاں وہ لوگ انڈیا مُنتقل ہو گئے تھے۔

اپنے والد صاحب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خورشید بی بی نے بتایا ''لاہور میں گڑھی شاہو ریلوے اسٹیشن کے قریب میرے والد صاحب پولو خان کو ایک ریلوے کوارٹر

ملا ہوا تھا۔ 1947 میں وہ متحدہ پنجاب کے اندر مسافر ٹرینیں چلاتے ہوئے تھے۔ 14 اگست کو وہ ایک مسافر ٹرین لے کر لاہور سے لدھیانہ روانہ ہو گئے۔ یہ ٹرین ہر ایک دِن بعد دونوں شہروں کے درمیان چلتی رہتی تھی۔ اُنہوں نے اگلے دِن (15 اگست 1947) یہ ٹرین واپس لاہور لے آئی تھی۔ تقسیم کا اعلان 14 اگست کو آدھی رات کے وقت کیا گیا تھا۔ تاہم مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فسادات پنجاب میں اس اعلان سے بھی پہلے ہی پھیل چکے تھے۔ پولوخان مذہب کے نام پر ہونے والے اس وحشیانہ قتل عام سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا: وہ اسی طرح بہادری کے جذبے سے سرشار مشرقی سے مغربی پنجاب ہجرت کے خواہش مند مسلمانوں سے بھری ہوئی ٹرین واپس لاہور لے جانے پر تلا ہوا تھا۔''

پہلے وحشت ناک واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کہ اس کے والد صاحب کا آنکھوں دیکھا تھا وہ بتاتی ہے کہ،''15 اگست کے دن لدھیانہ ریلوے اسٹیشن سے ایک مسافر ٹرین روانہ ہوئی۔ ٹرین مسلمان مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ لاہور کی طرف جاتے ہوئے پولوخان نے پٹڑی کے دونوں جانب سینکڑوں لاشیں بکھری ہوئی دیکھیں اور اُسے خبر تھی کہ ٹرین کے مسافروں کی زندگی خطرے میں ہے۔ چنانچہ وہ ٹرین کو اتنی تیزی سے بھگائے لے جا رہا تھا جتنی تیزی سے وہ چلا سکتا تھا۔ سٹیم یا بھاپ سے چلنے والے انجن کی سیٹی سے لگ رہا تھا کہ یہ لاہور کی جانب کوئی معمول کا سفر نہیں تھا۔ وہ امرتسر ریلوے اسٹیشن سے بحفاظت نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا، تاہم امرتسر سے آگے بعض شر پسند عناصر نے ریل کی پٹڑی اُکھاڑ رکھی تھی۔ لہٰذا ایک مہلک حادثے سے بچنے کے لئے پولوخان کو ٹرین روکنی پڑتی تھی۔ اُس نے ٹرین کو تو حادثے سے بچا لیا مگر اب ایک اور مسئلہ پیش آ گیا تھا اور وہ یہ کہ ٹرین کے رُکتے ہی شر پسند عناصر اندر گھس آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُن ہاتھوں میں تلواریں، چاقو، اور بندوقیں تھیں: بعض لوگوں نے باہر سے گولیاں چلانی شروع کر دیں اور بعض نے مسافروں کو چاقو اور تلواروں سے مارنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے بلا تفریق عمر اور جنس سب کو نشانہ بنانا شروع کر دیا اور معصوم بچوں اور بے بس خواتین کو بھی نہ بخشا۔ پولوخان بے بسی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ جب اُنہوں نے تمام مسافروں کو ہلاک کر دیا اور کوئی ایک بھی باقی نہ بچا تو پھر اسے اجازت دے دی گئی کہ وہ ٹرین لے کر چلا جائے جس میں اب ایک بھی مسافر زندہ نہیں بچا تھا۔ اور وہ مردہ اجسام سے بھری ہوئی ٹرین لے کر وہاں

سے روانہ ہوگیا۔

مسلمانوں کی ظالمانہ ہلاکتوں کا نظارہ کرنے کے بعد اُسے لاہور ڈویژن ریلوے سے احکامات وصول ہوئے کہ اب وہ سکھوں اور ہندوؤں سے بھری ہوئی ایک عدد اور ٹرین ننکانہ صاحب سے لے کر امرتسر چلا جائے۔

اس مرتبہ ٹرین میں غیر مسلم مسافر بھرے ہوئے تھے۔ ٹرین 16 اگست، 1947ء کی صبح اپنے وقت پر اسٹیشن سے روانہ ہوگئی۔ سفر لاہور ریلوے اسٹیشن تک بالکل ہموار اور محفوظ رہا۔ تاہم لاہور سے نکلتے ہی (ابھی پاکستانی حدود کے اندر ہی) امرتسر سے پہلے کچھ شر پسند عناصر ٹرین زکوا کر مسافروں کو ہلاک کرنے مصروف ہوگئے اور لاشیں اُٹھا اُٹھا کر دریائے راوی میں پھینکتے رہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی ہلاکتوں کا ردِعمل تھا۔''

خورشید بی بی نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے والد پولو خان نے کس طرح ایک ہندو ٹرین ڈرائیور گنگا رام کے خاندان کو موت کے مُنہ سے بچالیا تھا۔

''ایک ہندو ٹرین ڈرائیور گنگا رام جو کہ ہمارا ہمسایہ تھا ہمارے ہی علاقے میں کوارٹر نمبر 14 میں رہائش پذیر تھا۔ 15 اگست 1947ء والے دِن میں فیروز پور کیلئے ایک مسافر ٹرین لے کر لاہور سے روانہ ہوگیا۔ مگر جب وہ لاہور واپس آیا تو اسے پتہ چلا کہ فسادات بہت ہی زیادہ سنگین صورتحال اختیار کر چکے تھے۔ گنگا رام اپنے خاندان کے بارے میں پریشان تھا، تاہم چونکہ وہ ہندو تھا اس لئے اس کے ذہن میں خوف اسی قدر سرایت کر چکا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس جانے کی جرأت نہ کرسکا۔ اس عرصے کے دوران ہمارے گھر والوں نے گنگا رام کے خاندان کا خیال رکھا۔ تاہم آدھی رات کے وقت وہ واپس ریلوے کالونی پہنچ گیا۔ ایک دن اُس نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے والد صاحب باہر نکلے تو دیکھا کہ سامنے گنگا رام کھڑا ہے جس کے چہرے پر خوف و سراسیمگی کے سائے لہرا رہے تھے۔ میرے والد صاحب اپنے رفیقِ کار کو گھر کے اندر لے گئے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔ میرے والد صاحب نے گنگا رام کو بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہیں اور گھر کے اندر موجود ہیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے اس کی بیوی اور تین بچوں کو بُلایا اور اس کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان کی جانیں خطرے میں تھیں۔ مگر میرے والد صاحب نے ان کو مکمل تحفظ دیا۔ میری والدہ

نے گنگارام کے لئے رات کا کھانا بھی تیار کر دیا تھا۔

لاہور میں امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے پیشِ نظر گنگارام اور اس کے خاندان نے لاہور نہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس مقصد کے لئے انہیں بادشاہی مسجد لے جایا گیا جہاں اُنہوں نے باضابطہ طور پر اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کا خاندان ایک بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی پر مشتمل تھا۔ ان کے نئے اسلامی نام بالترتیب یوں تھے: عبداللہ (گنگارام)، فاطمہ (بیوی)، رمضانہ (بیٹی)، سردار علی (بیٹا)، اور رمضان (بیٹا)۔''

ان کے اسلام قبول کرنے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خورشید بی بی نے بتایا کہ،

''مجھے نہیں معلوم کہ اُنہوں نے اپنی جانیں بچانے کے لئے اسلام قبول کیا تھا یا کہ یہ ان کی اپنی آزادانہ مرضی کا فیصلہ تھا۔ تاہم وہ پکے اور سچے مسلمان بن گئے تھے۔ اگست 1947ء میں آنے والے رمضان میں عبداللہ اور اس کے بیوی بچوں نے پورے روزے رکھے تھے۔ وہ قرآن کی تلاوت بھی کرتے تھے اور باقاعدگی سے نماز بھی پڑھتے تھے۔ وہ تقسیم کے بعد چھ ماہ تک اس کالونی میں رہے اور عبداللہ لاہور میں ٹرین ڈرائیور کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ تاہم چھ ماہ کے بعد جب حالات ذرا بہتر ہوئے تو وہ لوگ انڈیا چلے گئے۔''

ان کی لاہور سے روانگی کے منظر کو ذہن میں لاتے ہوئے خورشید بی بی گویا ہوئی۔

''عبداللہ کے خاندان کے لئے یہ روانگی بہت اذیت ناک تھی۔ انڈیا جانے سے قبل فاطمہ ہمارے گھر آئی اور بولی کہ وہ انڈیا نہیں جانا چاہتی۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس نے کالونی کی دیگر عورتوں کو یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ اپنا نیا مذہب تبدیل نہیں کریں گے۔ اب وہ مسلمان ہی تھے: اور اب وہ اپنے نئے ملک انڈیا میں بطور مسلمان ہی جا رہے تھے نہ کہ بطور ہندو۔''

## مرزا نصیرالدین: فن تمام سرحدوں سے ماورا ہوتا ہے

80 سالہ مرزا نصیرالدین ایک سابقہ سرکاری ملازم ہے۔ اس کی کہانی یا آپ بیتی بہت سی وجوہات کی بناء پر اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو اس نے تقسیم کے دوران لاہور کے علاقے باغبانپورہ

میں رہنے والے بہت سے بے گناہ ہندوؤں کے جان بچائی تھی۔ دوسرے یہ کہ مرزا نصیرالدین کے بیٹے ندیم مرزا نے دومرتبہ انڈیا کا دورہ کیا ہے: ایک 1983ء میں اور دوسرا 2006ء میں۔

مرزا نصیرالدین کا تعلق باغبانپورہ، لاہور کے ایک معروف مرزا خاندان سے ہے۔ تقسیم کے وقت باغبانپورہ اندرون لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ایک دیہات ہوتا تھا۔ دیہات کے بیچوں بیچ مشہور صوفی شاعر مادھولال حسین کا مقبرہ تھا۔ جبکہ اس کی مشرقی سرحد پر شالامار باغ کے مغربی مینار آجاتے تھے۔ گاؤں کے زیادہ تر باشندے آرائیں مسلمان تھے۔ جیسا کہ نام باغبان سے ظاہر ہوتا ہے وہ لوگ شالامار باغ کے رکھوالے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ وہاں پُرانے ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی بھی تھی۔ میلہ چراغاں گاؤں میں سب سے زیادہ مقبول اور دھوم دھام سے منایا جانے والا سالانہ جشن ہوتا تھا مادھولال حسین کے پیروکار اُسے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے متصل دیہاتوں سے بڑی تعداد میں دھمالیں ڈالتے یہاں آتے تھے۔ یہ عوامی سطح پر بہت ہی زبردست سالانہ عرس ہوتا تھا جس میں پورے پنجاب سے لاکھوں لوگ شرکت کیلئے اُمڈے چلے آتے تھے۔ اس صوفی کو ابھی تک مقامی دانش اور روحانیت کا ''پیشوا'' سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں، مرزا ذہن پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہے، اُس کی پرورش اور تعلیم گورنمنٹ اسکول باغبانپورہ میں ہوئی تھی، جو کہ پل کنجری (اب ضلع امرتسر میں) تک 20 میل کے دائرے کے اندر اندر واحد ہائی اسکول تھا۔ طالب جوہری، ممتاز مفتی اور ایک ہندو شخصیت ماسٹر بھالا کا شمار، جو کہ اپنے شریفانہ رکھ رکھاؤ اور ریاضی کے علم میں مہارت کی بناء پر کافی مقبول تھا، اس کے مشہور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ گورنمنٹ اسکول باغبانپورہ سے تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد مرزا نصیرالدین نے سکھ نیشنل کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ وہ اِدارہ تھا جہاں مرزا اور اس کے بھائیوں کو نرانجن سنگھ جیسے دانشوروں کے علم سے، جو کہ نہ صرف ایک معقول مفکر تھے بلکہ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے بھائی بھی تھے، فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔

مرزا نصیرالدین بذاتِ خود بھی اُستاد خورشید بٹ کے انتہائی سینیئر شاگردوں میں شمار ہوتے تھے جو کہ ایک مشہور موسیقار ہونے کے علاوہ پنجابی شاعر بھی تھے اور اندرون لاہور بھاٹی گیٹ میں بودی کے نام سے جانے جاتے تھے، اگرچہ نوجوان مرزا نے گائیکی میں خود بھی اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ پیشہ ور لوگوں نے بھی ان سے رہنمائی حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔

نصیرالدین نے واقعات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ 1947ء کے اَواخر میں فسادات کے واقعات سارے پنجاب بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں عام ہونا شروع ہوگئے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ حالات جلد ہی معمول پر آنا شروع ہوجائیں گے مگر تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

14 اگست کو پاکستان کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی جیسے قہر ٹوٹ پڑا۔ امن وامان کی صورتحال قابو سے بالکل ہی باہر ہوکر رہ گئی۔ ادارے ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہوگئے اور قانون پر عملدرآمد کرنے والے اِداروں کے اندر بھی فرقہ ورانہ بنیادوں پر وفاداری کا رجحان زور پکڑ گیا۔ سرحد کے دونوں اطراف خاندان مُنتشر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ پورے انڈیا میں انسانوں کا بے رحم قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ لاہور میں کوئی 5 لاکھ کے قریب ہندو، ایک لاکھ کے قریب سکھ اور ان سب سے بھی زیادہ مسلمان آباد تھے کیونکہ لاہور سے متصل دیہاتوں میں بھی ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ باغبانپورہ میں گورنمنٹ اسکول کے ماسٹر بھالا کی ہلاکت فسادات کی آگ کی پہلی چنگاری تھی۔ اس نرم دِل انسان کے خیال میں اس نے اتنے مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا تھا کہ ان کی عزت کا حقدار ہوگیا تھا۔ اور اس کا مفروضہ غلط نہیں تھا۔ اس کا کوئی شاگرد اس طرح کی ہولناک واردات کے ارتکاب کا تصوّر ہی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اصل میں ایک مجرمانہ ذہنیت کا حامل شخص صدیق موچی تھا جو کہ چوری اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں بھی مطلوب تھا، جس نے کہ اسے دِن دیہاڑے خنجر کے وار کر کے ہلاک کر دیا تھا اور اسے ایک مقدس عمل قرار دے ڈالا تھا۔

مرزا ظہورالدین جو کہ نصیرالدین کے والد اور ریٹائرڈ ریلوے آفیسر تھے، اپنے دوستوں میاں خاندان کے میاں فاضل اور میاں رُشید جو بعد میں پاکستان کے اوّلین چیف جسٹس بن گئے تھے، کے ساتھ بیٹھے تھے جب اُنہیں پتہ چلا کہ ماسٹر بھالا کو بڑی بے دردی کے ساتھ خنجر کے وار کر کے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وہ تینوں سخت مشتعل ہوکر رہ گئے تھے۔ اس خوفناک خبر کو سُنتے ہی مرزا سینئیر غصے اور طیش کے عالم میں اُٹھے اور جائے واردات پر پہنچنے کی کوشش کی، مگر ان کے نام نہاد ہمدردوں نے اُنہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں وہیں پکڑ لیا۔ اُنہیں ایک طرف لے جا کر ان کے خیرخواہوں نے مقصد کی طرف داری نہ کرنے پر دماغی خلل کا شکار قرار دے دیا۔ اُنہیں اتنا بھی علم نہیں تھا کہ مرزا ظہورالدین وہ شخصیت تھی جس نے جنرل ڈائیر کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر ٹائی سے

پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس وقت وہ ایک نوجوان ٹیلی گراف آفیسر تھا اور امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں ہونے والے قتل عام پر سراپا احتجاج تھا۔

یہ واقعہ سُناتے ہوئے کہ اُس نے کسی طرح بے گناہ ہندوؤں کی جان بچائی تھی مرزا نے بتایا کہ، ''میں کلاسیکی موسیقی میں مہارت رکھتا تھا اور دو بنگالی ہندو بھائی کے۔ پی بھٹا چاربی اور پی ڈی بھیٹا چرجی میرے پاس موسیقی سیکھنے آتے ہوتے تھے۔ اوّل الذکر آل انڈیا ریڈیو لاہور سٹیشن پر وائلن نوازت تھا۔ یہ دونوں بھائی بھی باغبانپورہ میں رہتے تھے جو کہ اس وقت لاہور کا ایک دور دراز علاقہ اور مرکز سے بہت دور تھا۔ 20 اگست کی بات ہے کہ ماسٹر فیروز دین جو کہ ایک مسلمان موسیقار اور میرا شاگرد بھی تھا، میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تشدد پسند مقامی مسلمانوں کا ایک گروہ باغبانپورہ کے ہندوؤں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ اگرچہ باغبانپورہ لاہور کے مرکز سے بہت دور تھا مگر اسے سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا کیونکہ جواہر لعل نہرو اپنے دورۂ لاہور کے دوران نہیں قیام کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے باغبانپورہ کا شمار لاہور کے بہت حساس علاقوں میں ہوتا تھا اور مقامی مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں پر حملے بڑھتے جا رہے تھے۔ بھٹا چرجی کے بچوں میں سے ایک بچہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ، ''ماں جی ڈری ہوئی ہیں اور چلا رہی ہیں، ابو بھی خوفزدہ ہونے کی وجہ سے نہیں آسکتے اور ہماری رہائش گاہ کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ امی اور ابو پوچھ رہے ہیں کہ وہ کیا کریں؟'' میں اُسی وقت اس بچے کے ساتھ چل پڑا اور ان سب کو بحفاظت اپنے پاس لے آیا۔

میرے گھر والوں نے اس علاقے کے ہندوؤں کو پناہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لہٰذا میں نے ان سے کہا کہ وہ ہندوؤں کی آمد کی پرواہ نہ کریں۔ اور معاشرے کے کسی بھی فرقے سے تعلق رکھنے والے بے گناہ لوگوں کو پناہ نہ دینا غیر اخلاقی اور گری ہوئی حرکت ہوگی۔ ہم نے ان کو دو دِن تک پناہ دیئے رکھی۔ چند ایک مسلمانوں کو پتہ چل گیا تھا کہ ہم نے ہندوؤں کو پناہ دے رکھی تھی اور وہ ڈر گئے تھے، مگر ہم بے گناہ ہندوؤں کی جان بچانے کے لئے ڈٹے رہے۔''

چند دنوں کے بعد نصیر الدین نے ہندوؤں کو مسلمانوں والا لباس پہنایا یعنی مردوں کو رومی ٹوپی اور خواتین کو بُرقع پہنا دیا گیا۔ ان لوگوں میں اس چُلنے میں واہگہ بارڈر پہنچا دیا گیا جہاں سے وہ بحفاظت سرحد پار کر کے انڈیا پہنچ گئے۔

ان تاریخوں کو یاد کرتے ہوئے جب ہندوؤں نے سرحد پار کی تھی وہ بتاتا ہے، ''میں نے جب اُنہیں سرحد پار کرنے میں مدد دی تھی تو وہ غالباً 22 یا 23 اگست کا دن تھا۔''

تقسیم کے ایک برس بعد اپنے دورۂ ممبئی کی بات کرتے ہوئے مرزا کہتا ہے ''تقسیم کے ایک برس بعد میں نے 1948ء میں نے گردبار فلم پروڈکشن کی دعوت پر انڈیا کا دورہ کیا تھا۔ اس فلم کمپنی کے مالک، ایک سندھی، گرداری لال سیٹھ نے میرا بہت ہی گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ جب ایک اور فنکار رمیش ٹھاکرنے اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ میں نے چند ہندوؤں کی جان بچائی تھی تو اُنہوں نے پوجا کی حد تک احترام کا مظاہرہ کیا۔ وہاں میری ملاقات ہندو بلوائیوں سے ہوئی کیونکہ وہاں گرداری لال سیٹھ نے اس طرح کی ملاقاتوں کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس نے ان بلوائیوں کو بتایا کہ تم لوگوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا تھا جبکہ میں (مرزا) نے ہندوؤں کی جان بچائی تھی۔ وہ آگے بڑھے میرے پاؤں چھوئے اور پھر اپنا نکتۂ نظر بیان کیا: ''جناب ہم وحشی نہیں ہیں، ہماری جنگ انسانیت کے بے رحم قاتلوں کے خلاف تھی نہ کہ مسلمانوں کے خلاف۔ یہی وجہ ہے وہ ان مسلمانوں کے منہ سے بھی سُن چکا تھا جو پاکستان کے اندر فرقہ ورانہ ہلاکتوں کا کھیل کھیلتے رہے تھے۔''

اگر کسی نے ان واقعات کے حوالے سے مرزا نصیرالدین کا ردِّعمل معلوم کرنا ہو تو اس کے جوابی تاثرات کچھ اس طرح کے تھے کہ وہ آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا کر کچھ یوں دیکھنا شروع کر دیتا جیسے اُن حقیقی درندوں کو تلاش کر رہا ہو جنہوں نے ان تمام ظالمانہ کاروائیوں کا ارتکاب کیا تھا جس میں لاکھوں افراد اپنی جانوں کے علاوہ تمام اثاثوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ جب وہ مایوسی کے عالم میں اپنے ہاتھ اوپر اُٹھاتا تو وہ لمحات ایک کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپک جاتے اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اسی کو جواب مل گیا ہو۔ جبکہ اس کی شہادت کی انگلی کا رُخ آسمان کی طرف ہوتا تو باقی چار اُنگلیاں خود اس کی جانب اشارہ کر رہی ہوتیں۔ آسمانی طاقت کو الزام نہیں دیا جا سکتا تھا بلکہ سب کچھ زمین پر ہی کیا گیا تھا۔ وحشی درندے ہر طرف نظر آ رہے تھے اور ہر ایک نے خود اپنے اندر کے وحشی درندے کو قابو میں رکھتا تھا۔ وہ زیرلب کہہ رہا تھا 'پھر کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔' اُسے علم تھا کہ اب سوائے معافی کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ بھلا دیئے، آگے بڑھتے اور اس امر کی ضمانت کا، کہ ایسا دوبارہ نہیں ہوگا، مطلب یہ تھا کہ جو کچھ ہو چکا تھا اس پر اپنی اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا جائے اور ایک دوسرے سے معافی مانگ لی جائے۔ یہ ضروری تھا کہ ان سب

لوگوں کی کوششوں کا اعتراف کیا جائے جنہوں نے اس موقع پر جرأت سے کام لیا اور ان کے انسانی جذبات وحشیانہ جذبوں پر غالب آ گئے تھے۔ اُسے علم تھا کہ آنے والی نسلیں نہ صرف اس کی اپنی کوششوں کو بلکہ اسی طرح کے مثالی جذبے کا مظاہرہ کرنے والے دیگر افراد کی کوششوں کو بھی سراہیں گی۔ یہ وراثت جاری رہے گی۔

## ڈاکٹر آصف نثار: مزنگ کے سکھ باشندوں کی جانیں بچائے جانے والے واقعات کا عینی شاہد

67 سالہ ڈاکٹر آصف نثار لاہور میں اپنی ذاتی کلینک چلاتے ہیں۔ اس کے والد صاحب کا نام رشید احمد تھا۔ اس کے دادا جی چوہدری سراج الدین لاہور کے مشہور علاقے مزنگ کی ایک معزز اور معروف شخصیت تھے۔ یہ علاقہ مختلف فرقوں کے مابین ہم آہنگی اور مل جُل کر امن سے رہنے کی خصوصیت کی بناء پر شہرت رکھتا تھا۔ اس کے دادا جی کی پودوں کی نرسری ہوتی تھی جو کہ 1905ء میں قائم کی گئی تھی۔

1945ء میں ڈاکٹر آصف نے لاہور میں قائم رائے بہادر سوہن لال ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ تقسیم کے وقت وہ دوسری جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔

1947ء سے قبل کے زمانے میں مزنگ کے علاقے میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین پرامن بقائے باہمی کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف یوں گویا ہوئے، ''1947ء میں تقسیم کے وقت میری عمر 7 برس تھی اور میں اپنے ماں باپ اور دادا، دادی وغیرہ کے ساتھ مزنگ کے بڑے بازار (جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی) میں رہ رہا تھا۔ سکھوں کا ایک محلّہ بھی قریب ہی واقع تھا۔ وہاں سکھوں کے کوئی 15 یا 20 کے قریب مکان تھے جہاں وہ طویل عرصے سے رہ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بچے کے طور پر، تقسیم سے قبل، ہم نے اُنہیں کبھی بھی اجنبی یا غیر قوم کا نہیں سمجھا۔ مزنگ بازار میں سکھوں کی کپڑوں کی بے شمار دکانیں تھیں۔

ڈاکٹر آصف نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''14 اگست 1047ء کے بعد حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ ہمسایہ محلے میں رہنے والے سکھ اپنے تحفظ اور خوشحالی کے حوالے سے پریشان ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اسی فیصلہ کن قسم کی صورتحال میں ہمارے ہمسائے میں رہنے

والے سکھوں نے میرے دادا جی سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی اُن کی مدد کرنے کے ساتھ ہی اُنہیں تحفظ فراہم کیا جائے۔ وہ سکھ چھ روز تک میرے دادا جی کے ہاں رہتے رہے جس دوران ان پر باہر سے کسی قسم کا حملہ نہیں کیا جا سکا۔''

تقسیم کے دور پر اپنے ایک مضمون میں اشتیاق احمد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مزنگ میں صورتحال کس طرح بگڑ کر رہ گئی تھی۔ اس حوالے سے اُنہوں نے 12 اگست 1947ء کو پیش آنے والے ایک واقعے کا احوال یوں بیان کیا ہے:1

'' ٹپل روڈ پر ایک بہت لحیم شحیم قسم کا سکھ موٹر سائیکل چلاتا ہوا آ رہا تھا اور وہ جیسے ہی چوک بھوند پورہ پہنچا تو چند ایک مقامی غنڈوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن جیسے ہی اُنہیں پتہ چلا کہ اس کے پاس بندوق بھی ہے تو وہ فوراً ہی وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک اور سکھ اسی راستے پر آتا ہوا نمودار ہوا جو کہ ایک کمزور اور نحیف ونزار ترکھان تھا اور ایک پُرانی سی خستہ حال سائیکل چلا رہا تھا۔ بہت سے اور دیہاڑی دار مزدوروں کی طرح اُس نے بھی اپنا دوپہر کا کھانا ایک پوٹلی میں باندھ کر ہینڈل کے ساتھ لٹکا رکھا تھا۔ وہ حسب معمول اپنے کام پر جاتا دِکھائی دے رہا تھا اپنے اِردگرد کی سیاسی ہلچل سے بے خبر۔ اُنہی شر پسند عناصر نے اب کے اس پر دھاوا بول دیا۔ ایک نے اُس کو چاقو یا خنجر گھونپ دیا۔ وہ چلایا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ قریب ہی ایک تانگہ گزر رہا تھا تو اس نے تانگے پر سوار ہونے کی کوشش کی۔ تانگے والے نے اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ اس پر حملہ کرنے والے اب اُس کے قریب پہنچ چکے تھے اور اُنہوں نے چند ایک ضربیں لگا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مدد اور رحم کے لئے چلاتا ہوا موت کے مُنہ میں چلا گیا۔''

اس مضمون سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مزنگ پر ہونے والے حملوں کے پس پردہ دو اسباب کارفرما تھے۔ ایک تو یہ کہ یہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی ہلاکتوں کا انتقام تھا۔ دوسرے یہ کہ بہت سے مسلمانوں کو خوف تھا کہ اُنہیں لاہور سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔2

یہ بیان کرتے ہوئے کہ آخر کار سکھ خاندان وہاں سے بچ نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے تھے، ڈاکٹر آصف نے بتایا، ''میرے دادا جی کے ہاں چھ روز قیام کرنے کے بعد سکھ خاندانوں نے امرتسر نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہوں نے میرے خاندان والوں کو اپنے منصوبے سے آگاہ

کر دیا اور کہنے لگے کہ اگر چہ وہ لاہور چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتے مگر بدلتے ہوئے حالات نے ان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی زندگیوں کے تحفظ کی خاطر وہاں سے کوچ کر جائیں چنانچہ اگست 1947ء کی ایک رات، غالباً 20 اگست کو تمام سکھ خاندان مزنگ سے روانہ ہو گئے۔ اُنہوں نے خود کو ٹوپی والے برقعوں میں چھپایا ہوا تھا۔''

اسی واقعے سے پھر ایک اور اہم اور عجیب نکتہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ برقع ایک ایسی علامت تھی جسے مسلمان اپنے اور غیر مسلموں کے درمیان امتیاز کیلئے استعمال کرتے تھے۔ تاہم بحران کے دنوں میں اسے دوسرے غیر مذاہب کے بے گناہ افراد کو بچانے کے لئے استعمال میں لایا گیا تھا۔ چنانچہ مسلمان مردوں کے تحفظ میں ہی سکھ خاندان لاہور میں واقع سکھ اور ہندو مہاجر کیمپوں تک بحفاظت پہنچے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی منزل، امرتسر تک بھی بغیر کسی نقصان اور چوٹ وغیرہ کے کامیابی سے پہنچ گئے تھے۔

55-1954 میں لاہور میں تقسیم کے بعد کے اوّلین کرکٹ میچ کے دوران غیر مسلم خاندانوں کے ساتھ ہونے والے میل ملاپ پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف نے کہا:3

'' 55-1954 میں پاکستان اور انڈیا کے درمیان ایک کرکٹ ٹیسٹ سیریز کا پاکستان میں آغاز کیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ انڈیا سے میچ دیکھنے پاکستان آئے تھے۔ وہ سکھ خاندان بھی جو لاہور میں ہمارے محلے مزنگ میں رہ رہے تھے، میچ دیکھنے پاکستان آئے۔ وہ اپنے پُرانے محلے کی زیارت کو بھی آئے اور ان گھروں میں گئے جہاں اب (انڈیا یعنی مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے) مسلمان رہ رہے تھے۔ وہ چند روز ہمارے مہمان رہے۔ 7 برسوں کے بعد مزنگ کے چند پُرانے مکین اسی قابل ہوئے تھے کہ اپنے ان مقامات پیدائش اور رہائش گاہوں کی زیارت کر سکیں جہاں اُن کی کئی نسلیں رہتی چلی آئی تھیں۔ اُنہوں نے ہمارے خاندان والوں کا شکریہ بھی ادا کیا ہم نے اُن کی جانیں بچائی تھیں۔ وہ ہم سب افرادِ خانہ کے لئے انڈیا سے بہت سے تحائف بھی لائے تھے۔''

اشتیاق احمد جو کہ ان واقعات کا چشمِ دید گواہ ہے، یوں رقمطراز ہوتا ہے:4

''مجھے یاد ہے کہ ہمارے علاقے مزنگ میں اجنبی لوگ ٹولیوں کی شکل میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ بعض مکانوں اور دکانوں کے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے

داڑھیاں اور پگڑیاں اضافے بھی تھے مگر اکثریت کا حلیہ یا شکل وغیرہ ہمارے بزرگوں کی طرح ہی تھا۔ ان میں سے کچھ دھاڑیں مارتے پھر رہے تھے اور ہمارے اپنے بزرگ، چوہدری صاحب، میاں صاحب اور شاہ جی و شیخ صاحب وغیرہ اور بہت سے دوسرے اُنہیں گلے لگاتے اور خود بھی رونے لگ جاتے۔''

ڈاکٹر آصف نے ایک اور بہت ہی دلچسپ قسم کا نکتہ بھی بیان کیا ہے:

''مجھے ابھی تک ان لوگوں کی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ انڈیا واپسی کا منظر یاد ہے۔ اور ایسا دوسری مرتبہ ہوا تھا کہ اُنہیں برصغیر کی انڈیا اور پاکستان میں تقسیم کی وجہ سے اپنے گھروں سے دوبارہ جُدائی کے تجربے کا دُکھ محسوس ہو رہا تھا۔''

ڈاکٹر آصف نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں پاکستانی فوج کے طبی شعبے کے رُکن کے طور پر بھی خدمات سرانجام دی تھیں اور اگرچہ اب وہ مزنگ سے کب کے گلبرگ منتقل ہو گئے ہیں مگر ان کی کلینک مزنگ میں ابھی تک موجود ہے۔

# حوالہ جات

1۔ دی ڈیلی ٹائمز ''کرائمز اگینسٹ ہیومینٹی آن ٹمپل روڈ''، 25 جولائی 2004، از اشتیاق احمد

2۔ اسی کتاب/مضمون میں ملاحظہ کریں۔

3۔ کرکٹ سیریز پر مضامین کے لئے دیکھئے، دی ڈیلی ٹائمز میں ''قرام لاہور 1955ء ٹوموہالی ان 2005''، 8 مارچ 2005، از اشتیاق احمد۔ انڈیا سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں کا انٹرویو کیا گیا تھا اُنہوں نے اس سیریز کے دوران حقیقتاً پاکستان کا دورہ کیا تھا۔

4۔ ذی ڈیلی ٹائمز ''قرام لاہور 1955ء ٹوموہالی اِن 2005''، 8 مارچ 2005، از اشتیاق احمد۔

# چند تفکرات

اس باب میں اُجاگر کئے گئے بعض نکات ان سوالوں کے جوابات ہیں جن میں سے چند ایک تو ہماری تحقیق کے دوران سامنے آئے اور کچھ ایسے جو بیچ میں کبھی کبھار ہمارے ذہنوں میں اُبھر کر آجاتے رہے۔ سوالات اور ان کے ساتھ ہی اپنے مشاہدات کا آغاز کرنے سے قبل یہ امر واضح کرنا ضروری ہے کہ اس طرح کے زیادہ تر نکات یا انکشافات دوسرے لکھاری حضرات کی طرف سے بھی منکشف کئے گئے ہیں جبکہ بعض کو نظر انداز کر دیا گیا یا سرسری اہمیت دی گئی ہے۔ اس امر کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے سوالوں کے بعض بے لاگ اور واضح جوابات کے نتیجے کے طور پر ہم اس قابل ہو سکے ہیں کہ ان جوابات کو ایک معقول انداز میں وضاحت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

پہلے دو سوال جن کا ہم جواب دینے کی کوشش کریں گے درج ذیل ہیں:

تقسیم سے قبل مختلف فرقوں/طبقات کے درمیان کس طرح کے روابط یا بندھن پائے جاتے تھے اور آیا ان فرقوں یا طبقات کے درمیان اس طرح کی سماجی رُکاوٹیں موجود جن پر بروقت قابو پایا جا سکتا تھا؟

اگر ہم قبل از تقسیم کے معاشروں کے مجموعی نظم وضبط کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ 'قبیلے' یا برادری، مُشترکہ دیہی روایات، روابط اور اقتصادی مفادات کی بناء پر ایک طرح کا مربوط نظام موجود تھا۔ ان نکات پر تفصیلی تبادلہ خیال کی ضرورت ہے، تاہم اس سے پہلے ہمیں مختلف طبقات/فرقوں کے درمیان موجود مخصوص قابل شرم سمجھے جانے والے تصوّرات (Stigmas) کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ یہ مناسب رہے گا کہ ان استعاروں اور لوگوں، خاص طور پر انٹرویو کئے جانے والے افراد کی

آراء کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا جائے کہ آیا بڑے پیمانے پر وحشت و بربریت کا کھیل کھیلنے والے جنونی افراد کے ذہنوں میں نفرت کے ذمہ دار یہی شرمناک سمجھے جانے والے تصوّرات تھے۔اس کے بعد ہی یہ معقول نظر آئے گا کہ باہمی روابط پیدا کرنے والے عوامل تجزیہ کرنے کے ساتھ ہی ان عوامل پر بھی غور کیا جائے جو سماجی سلیبت کی عکاسی کرتے ہیں۔

اگر ممنوعات یا بندشوں کی بات کی جائے تو ہندو مسلمانوں کے برتن میں نہیں کھاتے تھے کیونکہ مسلمان گائے کا گوشت کھاتے تھے۔مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے شادی بیاہ میں بھی کھانا کھانے سے متذکرہ وجوہات کی بناء پر پرہیز کرتے تھے اور صرف اس طرح کی اشیاء جیسے خشک میوے، غلہ جات وغیرہ ہی مل کر کھاتے یا استعمال کرتے تھے۔اسی طرح دونوں فرقوں کے استعمال کا پانی بھی علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔اگر چہ اسے تقسیم کے پس پردہ عمومی عناصر میں شامل نہیں کیا جاسکتا، تاہم اس سے یہ امر ضرور واضح ہوجاتا ہے کہ معاشرے میں باریک سی تفریق موجود تھی۔1

تقسیم ہند کے پس پردہ ان سماجی بندشوں کے اثرات کے حوالے سے دو قسم کے مکتبۂ فکر پائے جاتے ہیں:

انٹرویو کیلئے جانے والے لوگوں کی اکثریت کے نزدیک اس طرح کی پابندیاں یا حدود قیود مذہبی نہیں بلکہ سماجی نوعیت کی تھیں اور تقسیم میں ان کا کوئی اہم کردار نہیں تھا۔درحقیقت دونوں فرقے ایک دوسرے کی ضروریات وجذبات کے معاملے میں بہت حساس تھے۔جہاں چند افراد اس طرح کی روایات کی معقولیت کا فہم رکھتے تھے وہاں دوسروں کو اس طرح کا کوئی شعور نہیں تھا جو لوگ اس طرح کی روایات کے پس پردہ وجوہات کا شعور رکھتے تھے ان کے نزدیک کے پس پردہ وجوہات کا شعور رکھتے تھے ان کے نزدیک یہ روایتی معنوں میں ایک سماجی ضابطہ تھا اور اس کا کسی مذہبی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔اس کے علاوہ صفائی ستھرائی یا پاکیزگی کا مسئلہ بھی تھا کیونکہ ہندو گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے اور مسلمان کھاتے تھے۔حقیقت میں ہندو ہڈی کی ملاوٹ والے چینی کے برتن میں بھی نہیں کھاتے تھے۔ 2

سومناتھ آنند کا حوالہ دیتے ہوئے اشتیاق احمد کہتا ہے:3

''مسلمان اور غیر مُسلم اکٹھے نہیں کھاتے تھے اور دونوں کے درمیان شادی بھی ممنوع

تھی۔ ہندوؤں کی کھانے کی عادات کے پس پردہ آلودگی یا نجاست کے اصول کارفرما تھے اور ان کا اِطلاق اونچی ذات کے لوگوں کی طرف سے نچلی ذات کے لوگوں پر بھی کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے نجس یا ناپاک لمس سے خود کو دور رکھنے کے لئے ہندوؤں نے اپنی روزہ کی زندگی میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کرلیں تھیں۔ مثال کے طور پر میری والدہ کسی بھی مسلمان کو باورچی خانے میں داخلے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ ان سے کسی طرح کی پکی پکائی چیز بھی قبول نہیں کی جاتی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اگر کسی مسلمان ہمسائے کی طرف سے میرے والد کے لئے کوئی مخصوص ڈِش یا پکوان بھی بھجوادیا جاتا تو پھر بھی یہ کھانے کی میز سے آگے نہیں جاسکتی تھی جو کہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں میری والدہ خود اپنا کھانا لے کر نہیں جاتی تھیں۔ وہ کھاتے ہوئے بھی اپنی کسی مسلمان دوست یا ہمسائی کو خود کو چھونے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ میرے بچپن میں اس طرح کی بندشوں پر عام طور پر تعلیم یافتہ ہندو خاندانوں کے مرد حضرات کی طرف سے اتنی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔''

ایک مختصر سی اقلیت کی رائے یہ تھی کہ اس طرح کی بندشوں نے اس حتمی تفریق پیدا کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجے میں تشدد اور بربریت نے جنم لیا۔ دراصل بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کا خیال ہے کہ ہندوؤں کے اس روایتی اور فرسودہ طریقۂ کار سے مسلمانوں کے جذبات بہت ہی مجروح ہوتے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ درج ذیل خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

''ہندوؤں کی طرف سے اس طرح کی مضحکہ خیز پابندیوں کے باوجود مسلمانوں نے اس صورتحال کو قانونِ فطرت سمجھ کر قبول کرلیا۔ ان کے آباؤ اجداد ہندوؤں کے ساتھ تعلقات کی ان حدود سے اچھی طرح آگاہ تھے اور انہیں اپنے برتنوں میں پانی تک پلانا نامناسب سمجھتے تھے..... ہندو ہمیشہ مسلمانوں کے جنونی پن کی شکایت کرتے رہے ہیں مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ جو دیواریں اُنہوں نے خود کھڑی کی تھیں ان کا نتیجہ اسی رویے کی صورت میں ہی نکلتا تھا۔''

ایک اور انٹرویو دینے والے نے بتایا کہ اس کی یہ پختہ رائے تھی کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ کھانا نہ کھانے کی عادت غلط تھی اور اس کا نتیجہ موخرالذکر کی بیگانگی کی صورت میں نکلا۔ اس کے خیال میں غیر مسلمانوں کے لئے عمومی طور پر اور سکھوں کے لئے خصوصی طور پر اس اس طرح کے رواج کی پیروی کرنا بالکل بلاجواز تھا خاص طور پر اس لیے بھی کہ سکھ مذہب کی بنیاد ہی ان رکاوٹوں یا پابندیوں کو دور کرنے کے لئے ڈالی گئی تھی۔5

اس مسئلے کے دو اور تناظر بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شہروں اور زیادہ بین الاقوامی رنگ میں رنگے ہوئے (Cosmopolitan) شہروں کے ماحول میں ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے ذہن میں اس طرح کے کوئی خدشات موجود نہیں تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوؤں کی ذہنیت کافی حد تک تبدیل کر کے رکھ دی تھی اور سماجی روایات پر منفی اثرات مرتب کرنے کی بجائے اُنہوں نے مثبت کردار ادا کیا، بلکہ ایک طرح سے اس امر کو بھی یقینی بنایا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حائل خلیج یا فاصلہ کم ہو جائے۔ 6 اور اگرچہ انٹرویو کئے گئے ان پڑھے لکھے افراد کا جنہوں نے مثبت پہلوؤں پر مبنی واقعات بیان کئے ہیں، یہ کہنا تھا کہ کچھ مخصوص بندشیں پائی جاتی تھیں، مگر پران نویل کی طرح کے لکھاریوں کے مطابق جنہوں نے کہ 30 اور 40 کی رہائشیوں کے زمانے کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہوا ہے، یہ امر طے ہے کہ برطانوی تعلیم نے مختلف فرقوں کے درمیان اُس دور کی کچھ تفریقوں کی شدت میں کمی پیدا کر دی تھی مثال کے طور پر، وہ خود بھی مسلمان دوستوں کے ساتھ کھانا نہ کھانے کی روایت پر عمل پیرا نہیں تھا۔ اسی طرح راجندر ناتھ چبر نے بھی جس کا تعلق راولپنڈی سے ہے، اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اُس کے گھر والے بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا لیتے تھے۔ 7

اسی طرح کے خیالات کا اظہار سومناتھ آنند نے بھی کیا ہے جس کا کہنا ہے کہ:

''اگرچہ ہندو۔ مسلم دوستانے کا جذبہ آنے والے برسوں میں کافی حد تک ماند پڑتا چلا گیا، تاہم سماجی سطح پر شہروں میں رہنے والے اونچے طبقے کے رویے میں مُثبت تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ یہ تبدیلی کچھ حد تک مغربی نظام تعلیم کی وجہ سے تھی۔ اس تبدیلی کی کچھ حد تک جھلک میرے والد صاحب کے رویے سے ظاہر ہوتی تھی۔ جب وہ نوجوان تھے تو میری والدہ کے مطابق اگر بازار میں چلتے ہوئے ان کے کپڑوں کو کسی مسلمان کے ہاتھ چھو جاتے تو وہ واپس آ کر یہ کپڑے تبدیل کر لیتے، مگر ماڈل ٹاؤن میں، جبکہ میرا بچپن کا دور تھا، والد صاحب کے بہت سے مسلمان دوست تھے اور ان کے نزدیک میری والدہ نے جو بندشیں عائد کر رکھی تھیں وہ پسماندگی کی علامت تھیں۔'' 8

آخری بات یہ کہ اونچے طبقے کے ان لوگوں کے علاوہ جو کہ ان تعصّبات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے، معاشرے میں کچھ اور طبقات بھی تھے جن کے نزدیک مذہب رکاوٹوں یا

پابندیوں کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا سیاسی نظریہ تھا جس کے وہ پیروکار تھے۔اس طرح کا ایک طبقہ کمیونسٹوں کا طبقہ تھا جن کے نزدیک کمیونسٹ نظریات مذہب سے زیادہ اہم تھے چنانچہ وہ ہر فرقے کے لوگوں کے ساتھ آزادانہ گھلتے ملتے اور کھانا کھاتے تھے۔9

اگلا نکتہ جس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جو مرد حضرات اس طرح کی روایت کی سختی سے پیروی نہیں کرتے تھے وہ زیادہ تر تشدد کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔لہٰذا ایک لحاظ سے یہ سوچنا غلط ہوگا اس طرح کی روایت کسی طرح کے اثرات یا حقیقی معنوں میں کسی مُثبت تبدیلی کی حامل نہیں تھی۔حتمی طور پر یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ تقسیم کے بعد کے انڈیا میں بہت سے مسلمان اس طرح کا تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں کہ جہاں تقسیم سے قبل کے زمانے میں ہندو اور مسلمان اکٹھے کھانا نہیں کھاتے تھے مگر اس کے باوجود وہ پُرامن طریقے سے رہ رہے تھے اور اب آزادی کے بعد یہ صورتحال اُلٹ ہوگئی ہے۔10

بلاشُبہ متذکرہ بالا پابندیاں یا بندشیں پہلے سے موجود تھیں اور یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ ان کے کچھ لوگوں کے ذہنوں پر منفی اثرات، مُرتب ہو رہے تھے۔یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ 'قبیلے'، 'مقام' یا ذاتی نوعیت کی دوستیوں کے باوجود مضبوط بندھن برقرار تھے۔اگر اس طرح نہ ہوتا تو مُثبت واقعات اور دیگر نکات کا جو کہ ہمارے اس مباحثے کے دوران سامنے آئیں گے، کیا جواز بنتا تھا۔

ہمارا اگلے سوال جس سے نمٹنا ضروری ہے، یہ ہے:

تقسیم ہند سے پہلے دیہاتوں اور قصبوں میں کس طرح کا بھائی چارہ اور موافقت پائی جاتی تھی؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں بہت سے ثقافتی اور مذہبی بندھن موجود تھے جن کی ایک واضح اور مکمل مثال بہت سی تقریبات اور تہواروں کو مل کر منانے کے عمل سے ملتی ہے۔ایک اہم نکتہ جس کا جائزہ لینا ضروری ہے یہ ہے کہ میلہ چراغاں جیسے تہواروں کو ہندو، مسلمان اور سکھ سب مل کر مناتے تھے۔11 حتیٰ کہ بعض مخصوص مذہبی تقریبات پر بھی تمام فرقوں کے لوگ اکٹھے ہو جاتے اور ایک دوسرے کے عقائد کے لئے بہت عزت واحترام پایا جاتا تھا۔جہاں مسلمان گورونانک دیو جی کا احترام کرتے تھے وہاں غیر مسلم بہت سے صوفیاء کرام مثلاً حضرت میاں میر وغیرہ کا احترام کرتے تھے حتیٰ کہ اگر مذہبی روایات میں فرق بھی موجود تھا تو پھر بھی ایک طرح کا ضابطہ موجود تھا اور کوئی فرقہ بھی دوسرے فرقے کے جذبات مجروح نہیں کرتا تھا جس کی ایک بہترین مثال اندر

اکٹھیالیا کے گھر کی ہے جہاں مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لئے بھی جگہ موجود تھی۔12

دوسرے یہ کہ دیہاتوں میں مسلمان، سکھ اور ہندو تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کا برابر احترام کرنے کی روایت عام تھی۔

تیسرا نکتہ یہ کہ ذات پات اور پیشوں کی مماثلت کو چھوڑ کر مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان قبیلے یا برادری کے بہت مضبوط رشتے پائے جاتے تھے۔ مذہب ایک غیر متعلقہ عنصر بن گیا تھا کیونکہ گاؤں، ذات پات اور پیشہ وہ مشترکہ عوامل تھے جو تعلقات کو باہم مربوط کرتے تھے۔ بہت سی بیان کردہ مثالوں میں اتفاق کا عنصر انتشار کے عنصر سے زیادہ نمایاں تھا۔ اگرچہ دیہی علاقوں میں ''قبیلے یا برادری'' کا عنصر زیادہ نمایاں تھا جیسا کہ لدّھے والا وڑائچ میں جو مختلف مذاہب کے وڑائچ لوگوں سے آباد تھا، کھیوہ ہنڈالان میں جہاں مختلف ذاتوں کے ہنڈال آباد تھے اور روپ نامی گاؤں میں دیکھنے میں آیا تھا جہاں کہ بھنڈر لوگ آباد تھے، تاہم یہ بندھن تقسیم کے بعد قائم چلے آرہے ہیں اور صاف ظاہر ہے یہ بندھن کسی ایسے فرد کے لیے اور بھی گہرے رہے ہوں گے جیسا کہ سکھ اقلیت سے کسی شخص کا حقیقت میں کسی گاؤں کا سربراہ بن جانے یا دوسرے فرقوں کے لئے بھی قابلِ احترام ہونے کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض مخصوص مثالوں میں چند ایک ایسے افراد جیسے لدّھے والا کے بھاگ سنگھ وڑائچ اور سرگودھا کے پرتاپ سنگھ بجاج نے تو پاکستان کا جھنڈا بھی لہرایا تھا۔13

چوتھی بات یہ کہ فسادات کے اسباب کا گہرائی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس امر کی سمجھ ضروری ہے کہ یہ بیرونی عناصر ہی تھے جنہوں نے ایک دوسرے سے منسلک اور باہم مربوط دیہاتوں اور قصبوں کو تباہ حال اور منتشر کر رکھ دیا۔ مقامی لوگوں نے شاذ و نادر ہی فساد میں حصہ لیا تھا جیسا کہ بہت سی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ انٹرویو دینے والے تقریباً تمام افراد نے یہی نکتہ اُجاگر کیا تھا۔ اکثر مثالوں میں یہی دیکھا گیا کہ بیرونی عناصر مختلف حکمتِ عملیاں اختیار کر کے مقامی لوگوں کو اُکساتے اور اشتعال دلاتے رہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے ایک تو وہ سرحد کے اس پار سے آنے والے مہاجرین کی تکلیفوں کا ذکر کرتے اور دوسرے مغربی پنجاب میں شر پسند عناصر اس طرح کی بے بنیاد افواہیں بھی پھیلاتے رہتے تھے کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں اس کے اُلٹ صورتحال تھی، اور اتنی سنگین صورتحال میں بھی بہت سے افراد

نے اپنی جانوں کا خطرہ مول لے کر بے گناہ لوگوں کو بچالیا تھا۔14

پانچویں بات یہ نکتہ ہے کہ مختلف فرقوں/طبقوں کے مابین مضبوط روابط کی عکاسی اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اکثر لوگوں نے اپنے اثاثے اور قیمتی اشیاء جاتے ہوئے اپنے ہمسایوں کے پاس رکھوادی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو تو اپنے دوستوں پر بھی اس حد تک اعتماد تھا کہ اُنہوں نے اپنی قیمتی چیزیں ان کی تحویل میں رکھوادی تھیں۔ ڈاکٹر سنتو کھ سنگھ کی مثال میں بھی ان کے والد صاحب کا مسلمان دوست ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کی امانتیں واپس لوٹانے کے لئے سرحد پر پہنچ گیا تھا۔ ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے خیال میں یہ تقسیم یا ہجرت مستقل نہیں تھی اور یہ کہ وہ جلد ہی واپس لوٹ آئیں گے۔ سرحد کے دونوں جانب تقریباً جتنے افراد کا انٹرویو بھی کیا گیا ان سب کا یہی خیال تھا کہ یہ نقل مکانی عارضی تھی اور اسی لئے اُنہوں نے اپنے اثاثے اور قیمتی اشیاء اپنے مسلمان دوستوں کے پاس رکھ چھوڑی تھیں اور اس کا اطلاق معاشرے کے تمام طبقات پر ہوتا ہے۔

سماجی میل جول مذہب کی پابندیوں سے ماورا تھا، جس کی ایک مثال اس گرمجوشی کی صورت میں سامنے آتی ہے جس کا مظاہرہ تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں اطراف کے لوگوں نے ایک دوسرے کیلئے کیا تھا۔ وڑائچ خاندان، ڈاکٹر سنتو کھ سنگھ، جوگندر سنگھ کوہلی اور مرزا نصیرالدین ان سب کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا تھا جیسا کہ ان کے انٹرویوز سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اشتیاق احمد نے بھی اپنے بہت سے مضامین میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بعض ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں کہ لوگ خلوص کے مظاہرے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ وہ تقسیم کید وران اپنے دوستوں کو ہونے والے خسارے کی تلافی تک کے لئے تیار ہو گئے۔ جبکہ چند ایک اور مثالوں میں کاروباری شرکاء نے سرحدیں پار کر کے نہ صرف یہ کہ اپنے دوستوں کو گلے لگالیا بلکہ ان دوستوں کا کاروبار میں جو حصہ بنتا تھا وہ بھی انہیں ادا کر دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد لوگوں کے مابین گرمجوشی کے مظاہرے کے موضوع سے ہٹ کر اب ہم اگلے موضوع کی طرف آتے ہیں:

''کیا تقسیم کے بعد لوگوں کے درمیان باہمی میل جول میں اضافہ ہو گیا تھا؟'' اس سوال کا وسیع مفہوم میں جواب ''ہاں'' بنتا ہے۔ 1950ء کی دہائی میں پروان چڑھنے والے روابط آج کے

دور کی نسبت بہت وسیع تھے۔اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ خاندان ابھی تک نقل مکانی کے مراحل سے گزر رہے تھے۔تاہم اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اُس زمانے میں ویزے کی کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ پرمٹ سسٹم رائج تھا۔

1950ء کی دہائی میں، تقسیم کے چند برسوں بعد، باہمی روابط کا آغاز ہو چکا تھا۔انٹرویو کئے جانے والے بعض افراد کے مطابق یہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کا زمانہ ہی تھا جس دوران عوام کے عوام سے رابطہ کی راہ میں مُشکلات پیش آنا شروع ہوگئیں۔اگرچہ داخلے اور اخراج کے پرمٹ یعنی اجازت ناموں کا طریقہ کار اپنی جگہ موجود تھا اور ویزے جاری کرنے کا طریق عمل بھی نافذ ہو چکا تھا، مگر کسی کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دونوں ممالک کے لوگ ایک دوسرے سے اس حد تک الگ تھلگ ہو کر رہ جائیں گے جیسا کہ آنے والے برسوں میں دیکھنے میں آیا۔یاسمین خان نے بالکل درست کہا ہے کہ:16

''داخلے اور اخراج کے پرمٹ یا اجازت ناموں کا طریقِ عمل جو کہ مہاجرین کی آمدورفت کو باقاعدہ بنانے کی ایک منطقی کوشش کے طور پر شروع کیا گیا تھا، جلد ہی پابندیوں کے ایک ایسے تنظیمی ڈھانچے کی شکل اختیار کر گیا جو کہ اپنے طور پر برقرار و مستحکم رہنے کی صلاحیت کا حامل تھا۔اب مقصد یہ تھا کہ دُشمن ملک کے دہشت گردوں کو دور رکھا جائے.....اور سب سے بڑھ کر حکومتوں کو اب اس امر کا درست طور پر تعین کرنے کی ضرورت تھی کہ کون انڈین ہے اور کون پاکستانی۔''

ان روابط یا میل جول کی ایک اور بہترین مثال 1950 کی دہائی میں ہونے والے ان کرکٹ میچوں کی ہے جن کی بناء پر امرتسر سے بہت سے لوگ کو یہ موقع ملا کہ وہ لاہور کا دورہ کر سکیں۔اس نکتے کی بہترین وضاحت اشتیاق احمد نے کی ہے اور اس کے ساتھ کے ساتھ ہی انٹرویو کئے جانے والے بعض افراد نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔

چندی گڑھ سے تعلق رکھنے والے ایڈووکیٹ راجندرا ناتھ چبر نے گفتگو کرتے ہوئے اپنے مابعد تقسیم تجربات کی روشنی میں ایک دلچسپ مثال یہ دی کہ کس طرح تقسیم کے فوراً بعد کے برسوں میں اُس نے پنجاب یونیورسٹی کالج آف کامرس جالندھر میں داخلہ لیا تھا جس کا کہ پہلے کالج آف کامرس کے ساتھ باہمی تبادلوں کا پروگرام تھا اور یوں دونوں اطراف کے طلباء ایک دوسرے

سے ملاقات کرتے رہتے تھے۔ تاہم اُس کی اضافی خوش قسمتی یہ تھی کہ انڈیا میں پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر بھٹی اُس کا ہمسایہ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن دنوں چونکہ مہاجرین کی نقل مکانی کا عمل ابھی تک جاری تھا، اس لئے سفارت خانے یا قونصل خانے کراچی اور جالندھر میں کھلے ہوئے تھے۔ بھٹی نے چبر اور اس کے دوستوں کو پاکستان کے دورے کے لئے سفری اجازت نامہ جاری کر دیا۔ چبر کے مطابق 1951ء سے لے کر 1952 تک اس نے اس اجازت نامے کے ساتھ تقریباً ہر ہفتے ہی پاکستان کا دورہ کیا۔17

اس کے علاوہ انڈیا یا پاکستان سفر کرنے کی اجازت امرتسر یا لاہور کے کمشنر کی طرف سے بھی دی جاسکتی تھی جیسا کہ ذیل میں ذکر کیا گیا ہے:18

''یار اللہ بخش میں دوبارہ لاہور کا دورہ کرنے کی تمنا رکھتا ہوں۔ ہم ان دنوں میں ہی چکر لگائیں گے۔' میرے والد صاحب نے سرحد کی دوسری جانب اپنے ہم جماعت سے کہا تھا۔ یہ 1959ء کی بات ہے۔ وہ لوگ انڈو پاک انجینئرز کے ایک اجلاس کے سلسلے میں سرحد پر جمع تھے (ان کی بیگمات بھی، جن میں سے کچھ کے دلوں میں یادوں کی اپنی سی کسک باقی تھی، ساتھ آئی ہوئی تھیں) تاکہ سرحدی چوکیوں کی تعمیر کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا جاسکے جن کے نتیجے میں سرحدوں کی نشاندہی واضح ہو جاتی تھی۔ اُنہوں نے اپنے ساتھ مٹھائی بھی رکھ لی تھی کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ انڈیا کی جانب والے پنجاب میں پاکستانی پنجاب سے بالکل مختلف طریقے سے مٹھائی تیار کی جاتی تھی۔ اور اللہ بخش نے کہا تھا کہ' کیا تم لاہور آنا چاہتے ہو؟ آؤ ابھی چلتے ہیں۔ اُس نے کمشنر لاہور کو ٹیلی فون کر دیا تھا اور اپنے دو ہم جماعتوں اور ان کی بیگمات کے لئے لاہور کے دورے کے اجازت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ اپر باری دوآب نہر کی لاہور والی شاخ کے ساتھ ساتھ گاڑی چلاتے ہوئے لاہور شہر پہنچ گئے تھے۔''

اجتماعی سطح پر، بعض افراد کی طرف سے بغیر ویزا سفر کی بڑی دلچسپ مثالیں دیکھنے میں آئیں جن کا 1965ء کی جارحیت کے بعد تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی پہلی مثال انڈین پنجاب کے ڈیرہ بابا نانک سے کچھ افراد کی طرف سے سرحد پار کر کے بغیر ویزے کے ضلع نارووال کے اندر کرتاپور صاحب کے مزار کی زیارت کے لئے پہنچ جانے کی ہے۔ سکھوں کا یہ مقدس مزار اس جگہ واقع ہے جہاں سکھ مذہب کے بانی بابا گورو نانک نے اپنی زندگی کے 8 (برس گزارے

تھے۔ زائرین ایک پل کے ذریعے یا براستہ ریل سرحد پار کرنے کیونکہ وہاں ایک ریلوے لائن بھی تھی۔ 1965ء کے بعد اس پُل کو تباہ کر دیا گیا اور بغیر ویزے کے سرحد پار جانے کا تصور ختم ہو گیا تھا، اگرچہ اب پاکستانی حکومت نے واہگہ کے دونوں جانب کے مذہبی کارکنوں کی کوششوں کے پیشِ نظر بھارتی سکھ زائرین کو بغیر ویزے کے سرحد پار کرنے کی فراخدلانہ اجازت دے دی ہے۔ 19 یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے نتیجے میں دونوں ممالک کے مابین تعلقات کی نوعیت تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔

اگر چند ایک ایسی اہم علامات کا جائزہ لیا جائے جو سرحد کے دونوں طرف کے عوام کے لئے موزونیت یا مناسبت کی حامل ہیں تو اس حوالے سے پہلی واضح علامت وطن کی ہے۔ یہ نکتہ مثال کے طور پر، بڑی دلچسپی کا حامل ہے کہ جب بھی کسی جانب سے کوئی وفد یا لوگوں کی کوئی انجمن سرحد کے اُس طرف جاتی ہے تو اکثر اوقات کئی میل تک سفر کر کے یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا ان کے آبائی گھرانے یا علاقے سے کوئی اور بھی اس وفد میں شامل ہے یا نہیں۔ 20 یہ پہلو تعلقات کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

وطن کے علاوہ، دوسری اہم علامات جو سرحد کے اطراف لوگوں کے لئے بامعنی ثابت ہو سکتی ہیں، وہ ہیں مقدس مذہبی مقامات، درگاہیں وغیرہ۔ مثال کے طور پر مسلمان صوفیائے کرام کے انڈیا میں واقع مزاروں کیلئے عقیدت کے جذبات رکھتے ہیں۔ سکھوں کے دِل میں پاکستان میں واقع اپنے مقدس مزاروں کے لئے بہت زیادہ احترام پایا جاتا ہے اور اسی طرح ہندو بھی کٹاس راج کی طرح کی مذہبی یادگاروں سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔

اس سے اگلے سوال جس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ آیا جن لوگوں نے تقسیم کے دُکھ اور مصائب برداشت کئے اب ایک دوسرے سے مزید گریز کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ اس امر کا کوئی فیصلہ کُن ثبوت تو موجود نہیں ہے۔ تاہم اکثر اوقات سیاسی حوالے سے خود کو درست ثابت کرنے کے لئے لوگ اپنے خیالات کا بے تکلفی سے اظہار نہیں کر پاتے۔ اگرچہ تکالیف اور مصائب برداشت کرنے والے کچھ لوگ اپنے تعصّبات چھپانے میں ناکام رہتے ہیں۔ مگر ان کی اکثریت کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جس طرح اُنہوں نے دُکھ برداشت کئے تھے اسی طرح سرحد کے دوسری جانب کے لوگوں نے بھی کئے تھے۔ اس کا کافی حد تک انحصار انفرادی

رویے اور ذہنی بلوغت کی سطح پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مالویندر جیت سنگھ وڑائچ کو اپنے باپ سے محروم ہونا پڑا، اندرا کھٹپا لیا کو دادا جی سے جُدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا مگر اُنہیں اُس امر کا شعور تھا کہ جن گنے چنے افراد نے یہ جرائم سرانجام دیئے تھے وہ پورے کے پورے فرقے یا سماجی طبقے کے نمائندے نہیں تھے۔

حتمی بات یہ کہ اس سوال کا جواب کہ آیا انفرادی سطح پر لوگ اپنی دوستیاں اور روابط برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں یا نہیں بے شمار عوامل سے مشروط ہے اور اس کا کوئی ایک واضح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا انحصار اس امر پر بھی ہے کہ آیا وہ پاکستان کا دورہ کرنے کے قابل بھی ہوئے نہیں اور اسی طرح دوسری جانب سے بھی لوگ بھارت کا دورہ کر سکے تھے یا نہیں اور ایک اہم عنصر یہ کہ آیا ان کے کسی رشتہ دار یا دوست وغیرہ نے بھی دوسری طرف کا کبھی دورہ کیا تھا۔

اس ساری صورتحال کا دارومدار تقسیم سے قبل کے بندھنوں پر ہے اور اس امر پر بھی ہے کہ کیا خاندان کے افراد آپس میں جُدا ہو گئے تھے اور کیا مختلف فرقوں یا طبقات کے درمیان تعلقات پائے جاتے ہیں۔ تقسیم سے قبل کی دوستیاں اور ذات برادری پر مبنی تعلقات کا کردار دونوں جانب کے لوگوں کے مابین روابط اُستوار کرنے کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ 21

# حوالہ جات


1۔ یہ نکتہ بہت سے انٹرویوز کے دوران سامنے آیا۔

2۔ اندرا کٹھیالیا کی یہ پختہ رائے تھی کہ اگرچہ دونوں فرقوں کے مابین بہت سی رکاوٹیں تھیں، خصوصاً خوراک کے حوالے سے تاہم اس کا تقسیم کے حتمی عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح کے خیالات کا یا اظہار انڈیا اور پاکستان میں انٹرویو کئے گئے افراد کی اکثریت نے بھی کیا۔

3۔ دی ڈیلی ٹائمز ''پنجابی آئیڈینٹیٹیز بیفور دا پنجابز پارٹیشن'' 20 جون 2006، از اشتیاق احمد

4۔ اسی مضمون میں دیکھئے۔

5۔ بریگیڈئر ایس ایس چوہدری کا انٹرویو

6۔ پران نویل (Pran Nevile) سے انٹرویو

7۔ اسی انٹرویو کو اور راجندر ناتھ چبر کا انٹرویو ملاحظہ کریں۔

8۔ سومناتھ آنند کی کتاب سے حوالے کے لئے دیکھئے، دی ڈیلی ٹائمز میں ''پنجابی آئیڈنٹیٹیز بیفور پارٹیشن'' 20 جون 2006ء، از اشتیاق احمد

9۔ ڈاکٹر رینو کا سنگھ سے انٹرویو جس نے بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے افراد کی طرف سے قائم کئے گئے شہر ''پریت نگر'' میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کے حوالے سے گفتگو کی۔

10۔ اشیش نندی کے ساتھ انٹرویو

11۔ مرزا نصیرالدین کے ساتھ انٹرویو

12۔ اندرا کٹھپالیا اور اونا ہریمت (Oona Hiremath) کا انٹرویو

13۔ جہاں رنگپوری کا نمبردار، جو کہ سکھ اکثریت کا علاقہ تھا، ایک مسلمان تھا، وہاں مسلم اکثریت کے گاؤں لدّھے والا وڑائچ کا سرپنچ ایک سکھ تھا۔ غیر مسلموں کی جانب سے پاکستانی پرچم لہرانے کے حوالے سے معلومات ایم۔ ایس وڑائچ اور بلویندر سنگھ سے انٹرویو کے دوران ملی تھی۔

14۔ یہ حقیقت دونوں اطراف کئے جانے والے ہر انٹرویو کے دوران سامنے آئی۔

15۔ ڈاکٹر سنتوکھ سنگھ اور ریتندر سنگھ بھنڈر کے علاوہ دوسرے افراد کا انٹرویو بھی اس نکتے کی سمجھ کے حوالے سے بہت مفید ثابت ہوا۔

16۔ یاسمین خان کو بھیجے جانے والے سوالنامے کا جواب

17۔ راجندر ناتھ چبر کا انٹرویو

18۔ دیکھئے نیل کمال پوری کی تحریر ''دی آؤٹ سائیڈر''، سیمینار نمبر 567، نومبر 2006، ماخذ http://www.india-seminar.com/2006/567.htm.

19۔ ملاحظہ فرمائیں کرناپور کا ریڈور www.Kartarpur.com اس کے علاوہ دیکھئے میانی ٹی۔ ایس کی ''ساؤتھ ایشین کوآپریشن اینڈ ری رول آف دی پنجابز'' 2007، صفحات 73 تا 74

20۔ جوگندر سنگھ کوہلی، اور اوتار سنگھ کا انٹرویو

21۔ ایم۔ ایس وڑائچ، پریتم سنگھ ہنڈال، اور ریندر سنگھ بھنڈر کا انٹرویو۔

# مستقبل کی طرف نگاہ

اس کتاب کو اختتام کی طرف لے جانے سے قبل ہم نے بہ ضروری سمجھا کہ ایسی سفارشات کرنا مناسب رہے گا جو اس امر کی یقین دہانی کے حوالے سے اہم ہوسکتی ہیں کہ ہم نہ صرف یہ کہ ماضی کے المیوں سے سبق سیکھیں بلکہ یہ یقین بھی کرلیں کہ تقسیم کرنے والی طاقتیں جو تنازعات کے بیج بوتی ہیں اپنے منصوبوں میں ناکام ہی رہتی ہیں۔ ہم یہاں یہ نکتہ اُجاگر کرنا بھی پسند کریں گے کہ بہت سے افراد اور تنظیمیں ان سفارشات پر عملدرآمد کے حوالے سے سنجیدہ کوششیں کرتی رہی ہیں۔ اس حوالے سے چند ایک کوششیں کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور چند ایک ناکام۔ تاہم ہم نے کچھ نئی تجاویز پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اس سلسلے میں ہم سب پہلی سفارش یہ پسند کریں گے کہ تقسیم کے دوران پیش آنے والے مُثبت واقعات پر مزید ادبی تخلیقات، فلموں، اور ذرائع ابلاغ کی طرف سے اس موضوع کا وسیع تر احاطہ کرنے کی کوششوں پر توجہ دی جائے۔ ڈاکٹر حسن عسکری رضوی بالکل صحیح کہتے ہیں:1

''برطانوی ہندوستان کی تقسیم اور انڈیا اور پاکستان جیسی آزاد ریاستوں کی تشکیل کے ساتھ ہی سر اُبھارنے والے وحشیانہ فرقہ ورانہ فسادات میں ہزاروں افراد کو ہلاک کردیا گیا تھا۔ تاہم اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس طرح کی بربریت اور وحشت کے ماحول میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو تعاون اور تحفظ پیش کیا تھا۔ وہ وحشت اور دیوانگی سے بالاتر ہوکر انسانیت کی خدمت کر گئے تھے۔ اُن کے حوصلے اور جرأت کو تسلیم کرنا چاہیے تاکہ انسان کی نیک فطرت اور انسانیت سے محبت پر ہمارا یقین اور بڑھ جائے۔ ان کے نیک اعمال ہمیں جذبے اور اِرادے کی ایسی دولت سے مالا مال کردیں کہ اس کی بدولت ہم انڈیا اور

پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کو عبور کرنے کے لئے تعاون اور دوستی کے پُل تعمیر کر سکیں۔ انڈیا اور پاکستان کی حکومتیں اور عوام غربت، سُست رفتار ترقیاتی عمل اور سماجی عدم مساوات کے خاتمے کے ساتھ ہی باہمی اعتماد اور یقین کی فضاء کو مستحکم کر سکیں۔''

یہ امر نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے کہ ان خوبصورت اور متاثر کن واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا جائے کیونکہ تقسیم کے دور کے واقعات کا تجربہ کرنے والی نسلیں معدوم ہو کر منظر سے اوجھل ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم تقسیم کے دور سے زندہ رہتے آنے والے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کا انٹرویو، کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جنہوں نے ہمیں مثبت اور منفی دونوں قسم کے واقعات سے آگاہ کیا۔ تاہم یہ امر بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح کے باقی رہ جانے والے افراد کو معلومات کے ایک قیمتی ذخیرے کی مانند سمجھنا چاہیے اور ان کے تجربات کو باقاعدہ دستاویزی شکل میں محفوظ رکھ لینا چاہیے۔ اگر مُثبت تجربات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو پھر تقسیم کے دور کے محض منفی واقعات ہی غالب حیثیت اختیار کر جائیں گے۔ آنے والی نسلوں کے لئے اگر موجود نسل کے تجربات کو محفوظ نہ رکھا گیا تو پھر تقسیم کے دور کے مثبت واقعات ان کہے رہ جائیں گے۔ یہ ہمارے لئے بدقسمتی کا باعث صورتحال ہوگی کیونکہ بہت سے لوگوں نے دوسرے فرقے یا طبقے کے لوگوں کی زندگیوں کا دفاع بھی کیا تھا، جبکہ تقسیم کے دور کے ادب میں جا نکاہ واقعات، ظالمانہ ہلاکتوں، عصمت دری اور لوٹ مار جیسے منفی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فہمیدہ بانو کی طرح کی کہانیوں سے یہ نکتہ بھی واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ جنوبی ایشیاء میں عزت کا تصوّر محض بدلے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس زبان اور وعدے کی پاسداری بھی 'عزت اور وقار' کا ایک اہم جزو ہے۔ اسی طرح اگرچہ مذہبی شخصیات پر صرف جنونیت یا انتہا پسندی کا الزام ہی لگایا جاتا ہے اور ان کی طرف سے بے گناہوں، خاص طور پر خواتین کو درگاہوں میں پناہ دے کر بچا لینے کے واقعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگرچہ اس طرح کے واقعات مذہبی انتہاء پسندی وغیرہ کے غلط تصوّرات کو مکمل طور پر بالکل تو ثابت نہیں کر سکتے مگر کم از کم ان مذہبی جنونیوں کو سوچنے پر ضرور مجبور کر سکتے ہیں جو محض نفرتوں کا کاروبار کرتے ہیں۔

ہم اس حوالے سے جو دوسری سفارش یا تجویز پیش کرنا پسند کریں گے وہ یہ ہے کہ واہگہ بارڈر پر یادگار نما عجائب گھر قائم کیا جائے۔ یہ یادگار تقسیم کے دور میں جبر اور ظلم کا شکار ہونے

والوں کی یاد کو دلوں میں قائم رکھنے کا کام کرنے کے ساتھ ہی ان افراد کے ناموں کو بھی نمایاں طور پر محفوظ رکھنے میں معاون ہو جنہوں نے دوسرے مذاہب/فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگیاں بچائیں۔ اس عجائب گھر یا یادگار کا مقصد کسی طرح سے بھی نفرت کا فروغ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا مقصد ماضی کی یاد دلانا اور مستقبل سے خبردار کرنا ہونا چاہیے۔ تقسیم کے دور کی یاد میں اس طرح کے عجائب گھر کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنے یا اس نظریے پر عملدرآمد کی راہ ہموار کرنے کے لئے نیویارک میں اسی طرح کے یہودی عجائب گھر، یعنی میوزیم آف جیوئش ہیریٹیج کی بات کرتے ہوئے ہمت سنگھ گل بالکل درست طور پر یہ نکتہ عیاں کرتا ہے کہ اس طرح کا عجائب خانہ کسی طرح نفرت پروان نہیں چڑھاتا:2

''یہودی عجائب گھر دراصل جرأت مند قسم کے لوگوں کی تاریخ، روایات، مصائب برداشت کرنے کی صلاحیت اور دائمی یادوں کا ایک جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ اس کی دیواروں کے اندر ہر گوشہ اور طاقچہ ایک ایسی پُرعزم نسل کے لوگوں کی بہادری، اُمید اور کامیابی کے جذبے کا آئینہ دار ہے جس نے کبھی بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ اور ماضی کو یاد رکھنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں نے اسے کبھی بھی اپنی مستقبل کی خوشحالی اور کامیابی کے اُجالوں کو دھندلانے کی اجازت نہیں دی۔''

خوش قسمتی سے واہگہ پر ایک یادگار قائم کرنے کی تجویز کی بہت سی تنظیموں نے بھی تائید وتوثیق کی ہے۔ اُن میں ہند۔ پاک دوستی مانچے اور ساؤتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن بھی شامل ہیں جو کہ 2003ء (جس برس امن کی کوششوں کا آغاز عمل میں آیا) سے ہی تقسیم کے دوران موت کے مُنہ میں چلے جانے والے افراد کی یاد میں اس طرح کی یادگار کی تجویز کی تائید کرتی چلی آرہی ہیں۔3

جاتی عمرہ انڈو۔ پاک پریوار ملاپ چیریٹی ٹرسٹ، جس کی سربراہی اس وقت کرنل ہمت سنگھ گل کے پاس ہے، جس کی اپنی تجویز بھی یہی ہے کہ،4

''واہگہ بارڈر پر ایسے علاقے میں یادگار قائم کی جائے جس پر کسی بھی مُلک کا دعویٰ نہ ہو، اور یہ اُن لاکھوں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی یاد میں ہو جو تقسیم کے وقت دنیا کی سب بڑی ہجرت کے دوران موت کا شکار ہو گئے تھے۔''

اس طرح کی عجائب گھر نما یادگار سرحد کے کسی بھی جانب غیر ملکیتی علاقے میں قائم کی جاسکتی ہے، مگر اس کا قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ اور اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ ان افراد کے نام

بھی یہاں محفوظ رکھ لئے جائیں جنہوں نے دوسرے فرقے/سماجی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیاں بچانے کے لئے خود اپنی جانوں کا خطرہ بھی مول لے لیا۔ ایسے واقعات کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے جن میں مذہبی تقدیس رکھنے والے مقامات یا درگاہوں کو بھی مخالف فرقے کے لوگوں کی جانیں بچانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا تاکہ آنے والی نسلوں کیلئے تقسیم کے اس گمنام گوشے کو بھی محفوظ حالت میں رکھ لیا جائے۔

سافما (ساؤتھ ایشیاء فری میڈیا ایسوسی ایشن) جیسے ادارے بھی ایک ایسا امن پارک قائم کرنے کی سفارش کر چکے ہیں جہاں شہریوں کے لئے کسی مشکل یا پریشانی کے بغیر آزادانہ میل جول رکھنا آسانی سے ممکن ہو سکے۔5

تیسری بات یہ کہ اگرچہ اب ایک خاص عمر سے بڑے افراد کے لئے بغیر کسی ویزے کی پابندی کے سفر کا مطالبہ ایک طرح سے بار بار دہرایا جانے والا فقرہ (Cliche) بن چکا ہے، مگر اصل میں ویزے کی پابندیوں میں نرمی کے حوالے سے عملی طور پر کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ جہاں تقسیم کے دور کے عینی شاہدین فطری طور پر تعصّبات کا شکار ہیں، مگر یہ بھی ایک عجیب تضاد ہے کہ یہی جو وہ لوگ ہیں کہ جن کو واہگہ کی دوسری سمت سے اُنس اور وابستگی محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہی ان کا وطن ہے۔ موجودہ نسلوں کے لئے، حتیٰ کہ وہ بھی جو تعصّبات سے پاک ذہن رکھتے ہیں، پاکستان ایک اور ملک کی طرح ہے اور یہی صورتحال پاکستان میں رہنے والوں پر بھی صادق آتی ہے۔ جبکہ فسادات سے محفوظ رہ جانے والوں کے لئے سرحد پار کا علاقہ ان کے سابقہ وطن کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل درست کہی گئی ہے کہ:

''وہ پنجابی جو 1947ء میں پاکستان بن جانے والے ملک سے انڈیا چلے گئے، ایک ایسی نسل جو معدوم ہوتی جا رہی ہے، اپنی جڑوں، اپنے گھروں، اپنے دوستوں، اپنے بچپن، اپنے اسکول کو کبھی بھی نہیں بھلا سکتے۔ اور یہی بات ان لوگوں کے لئے بھی صادق ہے جو بعد میں انڈیا بن جانے والے ملک سے پاکستان چلے گئے تھے۔''6

ایک شخصیت ایسی بھی ہے جو اس مطالبے کے حوالے سے ہمیشہ سے پُرجوش اور مستقل طرزِعمل کا مظاہرہ کرتی چلی آ رہی ہے اور وہ ہے مشہور لکھاری پران نویل، جو کہ 65 برس سے زیادہ عمر کے افراد پر سے ویزے کی پابندیوں کے خاتمے کے لئے کافی عرصے سے سرگرمِ عمل ہے۔

ابھی حال ہی میں مسٹر ترلوچن سنگھ، پاکستانی پنجاب میں جنم لینے والے ایک انڈین رُکن پارلیمنٹ، نے بھی 1947ء سے قبل پیدا ہونے والے تمام افراد کیلئے ویزے کی پابندیوں میں نرمی کے لئے کوششوں کا آغاز کر دیا ہے:7

''انڈین حکومت کو چاہیے کہ پر اُس پاکستانی شہری کو جو 1947ء سے قبل پیدا ہوا تھا، انڈیا کی موجودہ جغرافیائی حدود کے اندر واقع اس کے آبائی علاقے کا دورہ کرنے کی اجازت عطا فرمادے۔ ایسے لوگوں کو کچھ دنوں کے لئے عارضی اجازت نامہ عطا کر دیا جانا چاہیے تا کہ وہ اپنے بچوں کو بھی اپنے ساتھ لاسکیں۔ تقسیم سے قبل کے دور کی نسل اب تیزی سے معدوم ہوتی جارہی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے آبائی گھروں کا دورہ کریں۔ اسی طرح پاکستانی حکومت کو بھی یہی درخواست کرنی چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح جوابی طور پر تمام ہندوؤں اور سکھوں کو جو آزادی سے قبل پیدا ہوئے تھے پاکستان کا دورہ کرنے کی اجازت عطا کر دے۔''

پاکستان کی طرف سے مسلم لیگ (ن) کے لیڈر میاں نواز شریف نے ابھی حال ہی میں بڑے واضح طور پر اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ پاکستان کو انڈیا کے لوگوں کے لئے ویزے کی پابندیوں کے خاتمے کا اعلان کر دینا چاہیے، چاہے انڈیا اس طرح کی رعایت نہ بھی دے۔8

ہماری تحقیق اور مختلف افراد کے انٹرویو کے دوران جو نکتہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ آزادانہ میل جول دو قسم کے لوگوں کے لئے اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک تو وہ جن کے خاندان کے لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ کر رہ گئے تھے۔ اس حوالے سے جاتی عمرہ انڈو۔ پاک پر پورا ملاپ ٹرسٹ نے ایک خادمانہ قسم کا کردار ادا کیا ہے اور بچھڑ کر رہ جانے والے چند خاندانوں کے افراد کو آپس میں ملانے کی راہ ہموار کی ہے۔ 1988ء میں جب جاتی عمرہ انڈو۔ پاک پریوار ملاپ ٹرسٹ کے وفد نے کرنل پاناپ سنگھ گل کی قیادت میں پاکستان کا دورہ کیا تو گرموبیندر سنگھ (جس کا پیدائشی نام ماہان علی تھا) کی جو کہ تقسیم کے دوران سکھ مذہب کی طرف آ گیا تھا اپنی بڑی ہمشیرہ جانو سے ملاقات ہوئی تھی۔ 2000 میں اس ٹرسٹ نے پاکستان کا دورہ کیا اور درج ذیل لوگوں کی اپنے رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی تھی:9

''گُرنام کور (سابقہ خورشید بی بی) کی ملاقات اپنے بھائی اللہ رکھا سے، دیوان سنگھ (سابقہ دین محمد) کی ملاقات اپنے بھائی نبی بخش سے: سردار علی کی ملازمت اپنے بوڑھے باپ گاما

سے، اور سردار علی کی بیوی نادیہ کی ملاقات اپنے بھائی سراج خان سے ہوئی۔''

میل جول اور روابط کو آسان بنانے کے لئے یہ اہم ہے کہ نہ صرف ویزا کے مراحل کو آسان بنایا جائے بلکہ اس کے ساتھ ہی پاکستانی طرف سے لاہور اور کراچی میں اور انڈیا میں امرتسر اور یوپی سے زیادہ سے زیادہ ویزوں کا اجراء کیا جائے۔ اس طرح کے بے شمار مسلمان گھرانے ہیں جن کے کچھ افراد کراچی میں اور کچھ افراد یوپی میں رہ گئے ہیں۔ اسی طرح ایک عام پنجابی سے ہٹ کر جو کہ واہگہ کی دوسری جانب اپنے دوسرے پنجابی ساتھیوں سے روابط بڑھانے میں دِلچسپی رکھتا ہے، اور بھی بہت سے ایسے افراد ہیں جو اپنے اہلِ خانہ سے جُدا ہو کر رہ گئے تھے۔ اس حوالے سے ایک اچھی مثال پریتم سنگھ ہنڈال کی ہے جس کی پھوپھو/خالہ اور اس کا خاندان پاکستان میں رہ گئے تھے۔ اسی طرح مالویندر جیت سنگھ وڑائچ اور بھنڈر خاندان کے افراد کی مثال بھی ہے جو اگرچہ اپنے گھر والوں سے تو نہیں بچھڑے مگر ان کے بہت سے مسلمان رشتہ دار دوسری طرف موجود ہیں۔ یہ بات زیادہ معقول رہے گی کہ پنجابیوں کے لئے امرتسر سے ویزے جاری کئے جائیں بجائے اس کے کہ اُنہیں دہلی تک اتنی دور ویزے کے لئے سفر کرنا پڑے۔ اسی طرح پاکستان میں بھی مناسب یہی رہے گا کہ ویزے لاہور اور کراچی سے جاری کئے جائیں بجائے اس کہ لوگوں کو اتنی دور اسلام آباد کا سفر کرنا پڑے۔ دراصل اعتماد قائم کرنے کیلئے اقدامات (CBMS) اس لئے بھی ناکام ہو گئے ہیں کیونکہ ویزے کے اجراء کی شرائط اور طریقہ کار انتہائی فرسودہ، ناکارہ اور انسانی ہمدردی کے کسی بھی عنصر سے محروم اور خالی نظر آتا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ جن کے لئے ویزے کی پابندیاں نرم کرنے کی ضرورت ہے وہ ہیں جو تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی زد میں آنے سے بچا لئے گئے تھے اور جنہوں نے ان کو بچایا تھا۔ اس طرح کے تمام لوگوں کا ان کے خاندان والوں کے ساتھ ملاپ کروانا چاہیے تاکہ وہ پرانی یادیں تازہ کر سکیں۔ اس طریقے سے ''امن و آشتی کی سرگرمیوں'' کو استحکام ملے گا اور تقسیم کے دور کے واقعات کے یکطرفہ فہم اور تشریح کرنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

اگلہ نکتہ یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ کرنے کے عمل کی روک تھام کی جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بالکل درست کی گئی ہے کہ:

''دونوں ممالک کی نصابی کُتب میں تقسیم کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خُفیہ

مفادات رکھتے والے لوگوں کی طرف تاریخ کو مسخ کرنے کا عمل جاری ہے۔ان لوگوں نے نئی نسل کے ذہنوں کو زہر آلود کر کے رکھ دیا ہے اور ولن کا کردار ادا کرنے والوں کو ہیرو بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان مسخ شدہ حقائق کو فوری طور پر مسترد کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس طرح سے دونوں ممالک کے شہریوں کے مابین تفریقیں پیدا ہو رہی ہیں۔''10

اگر چہ نصاب میں تبدیلی لے آنا ایک مثبت اقدام ہے، تاہم اس کتاب میں جن واقعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ان کو نمایاں کرنا بھی ضروری ہے۔اس وقت نصابی کتب میں تقسیم کے منفی پہلوؤں کو بہت زیادہ اُجاگر کر کے دیکھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایسی مثالوں کو سامنے لانا ضروری ہے جن میں ایک فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو دوسرے فرقے کے مقدس مذہبی مقامات میں پناہ دے کر ان کی جانیں بچائی گئیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان مذہبی تفریق کا توڑ کرنے کے لئے مخلوط روایات پروان چڑھانے اور برداشت اور رواداری جیسی خصوصیات کو فروغ دینے کا عمل تیز کر دیا جائے۔اس طرح کی مخلوط روایات مثلاً صوفیانہ تعلیمات، پنجابی ادب اور سندھی ثقافت وغیرہ کو فروغ دینے کے لئے محرک فراہم کیا جائے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ یہی وہ مماثلتیں ہیں جنہوں نے بدترین حالات میں بھی دونوں ممالک کے درمیان رابطے کے پُل کے طور پر ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان یہ غلط فہمی کہ مذہبی تفریقوں پر قابو پانا ایک ناممکن کام ہے صرف اسی طرح کی روایات وثقافت کے فروغ کے ذریعے ہی دور کی جا سکتی ہے۔11

ہم ہمیشہ ہی 1947ء کے واقعات کے منفی پہلوؤں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔اب وقت آ گیا ہے کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ ان غلطیوں کا اعادہ نہ ہونے پائے۔اُمید ہے کہ 1947ء کے دوران مُثبت واقعات کی صورت میں اُمید کی جو کرن نظر آئی تھی اس کا جائزہ نہ صرف یہ کہ ہمارے اندازِ نظر کو تبدیل کر کے رکھ دے گا بلکہ ہمیں انسانیت کے حوالے سے مثبت سبق بھی سکھائے گا اب وقت آ گیا ہے کہ ہم 2047 کی طرف ایک کھلے دِل اور ذہن سے نگاہ کریں نہ کہ 1947 کے تعصّبات کے ساتھ۔

اکبر ایس احمد کی نظم ''جرنی ٹو پاکستان'' یا ''پاکستان کی جانب سفر'' برصغیر کے ماضی اور مُستقبل کے حوالے سے کئے گئے تمام مباحث کو بڑے خوبصورت انداز میں سمیٹتی ہے۔

# پاکستان کی جانب سفر

## میری پہلی پہلی یاد

جس نے میری شخصیت کی تشکیل کی
ابھی تک میری آگاہی میں
اضافہ کرتی چلی آرہی ہے
اور میں اسے برصغیر کے تمام لوگوں کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہوں
ایک کمسن لڑکا
ٹرین کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے میں
مدھم زرد روشنی میں بنایا ہوا
رات کے وقت ساکت
واماندہ
پنجاب کے ہلاکت خیز کھیتوں میں
میرے والدین روپوشی کی حالت میں
میرے ساتھ
دلی سے
روپوش ہوکر فرار ہوتے ہوئے
سست رفتار ٹرین پر
سخت گرمیوں کے دنوں میں
اور کراچی کی طرف
ایک نئے ملک اور
ایک نئی منزل کی جانب
بڑھتے ہوئے
میری ماں نے اصرار کیا تھا
کہ میرے بابا پچھلی ٹرین پر سوار نہ ہوئے
اور ان کا عورتوں کا سا گمان
درست ثابت ہوا تھا

اس ٹرین پر سوار تمام مسافروں کو
ذبح کر دیا گیا تھا
ماسوائے، یقیناً، انجن ڈرائیور کے
دونوں فریق محتاط تھے
کہ ایک وہی زندہ رہ جائے
اور میں اتنا کمسن بھی نہ تھا
کہ
اپنے گرد
ایک بلا جواز نفرت اور غصے کی
جھلسا کر رکھ دینے والی
تپش کو اور اس کے نتیجے میں
محبت دینے اور لینے کی شدید طلب
کو محسوس نہ کر سکتا
اور میں ہمیشہ سے
وہی لڑکا ہوں
ذرا سراسیمہ سا
کھویا ہوا
مگر ہمیشہ پھٹی پھٹی آنکھوں
تجسس بھری نگاہوں سے
اپنے ارد گرد رنگوں اور لوگوں
کی ایک گزرتی ہوئی دنیا کو
دیکھتے ہوئے
ہمیشہ پُر اُمید
کیونکہ میں جانتا ہوں
کہ کوئی بڑی طاقت
میری نگرانی کرتی ہے

# حوالہ جات


1۔ حسن عسکری رضوی سے انٹرویو

2۔ دی ٹریبون میں ''فارا ے میموریل ٹو پارٹیشن ہسٹری مسٹ فاٹ بی اِگنورڈ'' 3 جنوری 2005 کو شائع ہونے والا مضمون، از ہمت گل

3۔ شنام سنگھ مانک سے انٹرویو

4۔ دی ٹریبون ''میموریل موو ٹِڈ آن نو مینز لینڈ 05 مئی 2000

5۔ دی ٹریبون ''کینڈل لائٹ وِجل پر یچز پیس''، 16 اگست 2003

6۔ خالد حسن سے انٹرویو

7۔ دی ٹریبون ''فنکشنز اِن کنٹریز وِزیٹڈ بائی گورونانک''، 27 مارچ 2008، از اجے بنرجی

8۔ دی نیوز ''کین انڈیا اینڈ پاکستان اسٹیبلش اے ویزا فری ریزیم''، 17 اپریل 2008، از قدسیہ اخلاق اور محمد صالح ظفر

9۔ دی ٹریبون ''نیڈ ٹو کوریکٹ ہسٹوریکل ڈسٹارشن: زمان''، 19 دسمبر 2004ء

11۔ دیکھئے میانی، ٹی سنگھ کی تحریر ''ساؤتھ ایشین کوآپریشن اینڈ دا رول آف دا پنجاب''، صفحات 142 تا 143۔ اس کے علاوہ احسن، اے ''دی انڈس ساگا'' 2005 بھی ملاحظہ فرمائیں۔